5

comp,

مکران

بیل بوٹے

مظفّر حسین شمیم

شیخ غلام محمد اینڈ سنز تاجران کتب
مائسومہ بازار امیراکدل سری نگر کشمیر

ر سلطان حسین تاجر کتب و مالک مطبع سلطانی بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

U4
ش ۱۶ م ب
~~۹۸۸۴ ب~~

انتساب

سلطان شریف کانجی

و

عزیز شریف کانجی

کے نام

CHECKED
ST 01 1H
JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY LIBRARY
No 24894
Date 7-2-59
SRINAGAR

دُو دُو باتیں

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دَور
نکلے جو میکدے سے تو دُنیا بدل گئی

بادشس بخیر! آج سے پندرہ سولہ برس پہلے لاہور کی رومان انگیز فضا میں شعر و ادب کی لطیف چاشنی نے ایک عجیب نشہ آور کیفیت پیدا کر دی تھی۔ پنجاب کے دار السلطنت کا ہر گلی کوچہ شعر و ادب کی صداؤں سے گونج رہا تھا۔ علمی و ادبی جرائد کی روز افزوں تعداد اور تصنیفات و تالیفات کی کثرتِ اشاعت سے اس خطۂ زرخیز کے بڑھتے ہوئے ذوقِ ادب اور علمی انہماک سے لاہور میں ایک ادبی مرکزیت سی پیدا ہو چلی تھی۔ ملک کے اطراف و اکناف سے ارباب ذوق کے آپ سے آپ اِس طرف کھنچے چلے آنے سے یہاں پر نادر اہل قلم کا ایک قلم پرور اجتماع ہو گیا تھا۔ حضرت نسیم اس دور میں کلکتہ میں ادبی و صحافتی مشاغل میں منہمک تھے، لیکن یہاں کی ادبی فضا کی کشش نے انہیں بنگال سے اپنی علمی مصروفیتوں کو لاہور کی جانب منتقل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور وہ یہاں پہونچ کر علمی و ادبی حلقوں میں شیر و شکر ہو کر قلم و ادب کی خدمت میں ہمہ تن محو ہو گئے۔ یہاں پر اس دوران میں انھوں نے متعدد اخبارات

و رسائل کی ادارت کے فرائض بھی نہایت حسن و خوبی سے انجام دیئے۔

اسلامیہ کالج کی عظیم الشان عمارت کے سامنے ایک بے تکلف سا مختصر ہوٹل ہے۔ ایک عربی النسل "بڑے میاں" اس کے آقا و کارفرما تھے۔ یہ گنجِ اکل و شرب "عرب ہوٹل" کے نام سے مشہور ہے۔ اسے فطرت کی ستم ظریفی کہئے یا اتفاقِ زمانہ کہ اردو کے نامور شعرا، ادیب اور مدیرانِ جرائد یہیں کی سرِ راہ "پُرہجوم تنہائیوں" کے کچھ ایسے دلدادہ تھے کہ ہوٹل اچھا خاصا ادبی کلب گھر بن گیا تھا۔ اور بڑے میاں مقامی ادیبوں اور شاعروں کے مجسم اور حاضر باش انفارمیشن بیورو۔

یہاں کی ہر شام ادبی معرکہ آرائیوں اور علمی مباحثوں کا ایسا طلسمِ دلنشیں اپنے اندر لئے ہوئے تھی کہ اربابِ ذوق کوچۂ جاناں کی طرح اس کا طواف کرنے پر دل سے مجبور تھے۔ ان غیر منظم ادبی محفلوں کے فیض سے پنجاب کے بہت سے ادیب و انشا پرداز جنگل کے نوخیز پھولوں کی طرح پیدا ہوئے اور ناموری و شہرت کی وادیوں سے گذر کر آرائشِ بزمِ ادب بنے۔ عرب ہوٹل کی انھیں دلچسپ و علم نواز صحبتوں کی کششِ ایک شام ایک ادیب دوست کے ہمراہ مجھے بھی وہاں لے پہونچی۔ ادیبوں شاعروں اور اربابِ قلم کے اسی علم افروز ماحول میں مجھے شمیم صاحب سے اوّلین مرتبہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ اور یہیں اس مستحکم اور استوار دوستی کی داغ بیل پڑی۔ جس کے باعث مجھے یہ سطور لکھنے کی ترغیب ہوئی۔ ہر چند کہ یہ فرض کسی صاحبِ نظر اہلِ قلم کا تھا، لیکن میری بے بضاعتی اس راہ میں سدِ عمل ثابت نہ ہو سکی۔

کچھ عرصہ کے بعد انقلابِ زمانہ سے وہ محفلیں برہم ہوگئیں۔ اور

شمیم صاحب انجمن ترقی اردو کے مہتمم کی حیثیت سے اورنگ آباد چلے گئے۔ اس دوران میں مجھے ہندوستان کے مختلف مقامات کی کاروباری سلسلہ میں سیاحت کرنا پڑی۔ برسوں کے بچھڑے حسنِ اتفاق سے حیدرآباد (دکن) میں پانچ برس قبل یوں ملے کہ شمیم صاحب کو اس "عروس البلاد" میں دیکھ کر بے ساختہ یہ شعر میری زبان پر آگیا۔ ؎

اتنی مدت میں ملا مجھ سے وہ دھوکا دے کر
یاد ہی جب مجھے اُس شوخ کی صورت نہ رہی

حیدرآباد سے میں بمبئی چلا آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب شمیم صاحب بھی انجمن ترقی اردو کے کاموں سے فرصت پاکر یہیں تشریف لے آئے تو میں نے اور دیگر احباب نے انھیں اپنے پریشاں نثر و نظم کے ذخیرے کو جمع کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ لیکن ان کی کھوئی ہوئی طبیعت انھیں اس طرف مائل ہونے ہی نہ دیتی تھی۔ مگر جب ترغیب نے شدتِ تقاضا کی صورت اختیار کرلی تو انھوں نے یہ کہہ کر ٹالنے کی ٹھان لی کہ بیس بائیس برس کی منتشر نگارشوں کو کیونکر یکجا کیا جائے۔ جب کہ پرانے رسالوں کے فائل کی بہم رسانی محالات سے ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ یہ کام کچھ اُن کے بس کا بھی نہ تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال ان کے دل میں بس گیا اور انھوں نے اپنی ادبی کاوشوں کو مجتمع کرنے کی کوشش آغاز کردی۔ لیکن جب عملی قدم اٹھانے کی نوبت آئی تو اس کی دشواریاں محسوس ہونے لگیں۔ جس شخص نے جب سے ہوش سنبھالا ہو، لکھنے پڑھنے کے سوا کچھ کیا ہی نہ ہو اور جو کچھ لکھا ہو اس کے مسودات کو کبھی اٹھا نہ رکھا ہو۔ اس سے امید

بھی کیا ہو سکتی ہے۔ بنگال۔ بہار۔ یو۔ پی۔ دکن۔ پنجاب کے ہر اچھے رسالے میں جس کی نظموں۔ فسانوں اور مضامین کا شیرازہ گذشتہ بیس بائیس برس کے طویل عرصہ میں بکھرا ہوا ہو۔ اسے سلسلہ وار ترتیب دینے کی مشکلات کا صحیح اندازہ کچھ انھیں حضرات کو ہو سکتا ہے کہ جو ایسے کاموں سے متعلق رہ چکے ہیں۔ لیکن جو خیال دل میں جاگزیں ہو چکا تھا، اس کے پیش نظر جو جو نئے پرانے جرائد و رسائل جہاں کہیں سے بہم ہوتے چلے گئے اور ان سے جو مضامین مل سکے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ چنانچہ ایسے متعدد مجموعے تیار ہو گئے۔ جن میں سے "نگینے" اور "ریڈیو ڈرامے اور خاکے" حیدرآباد دکن میں زیر طبع ہیں اور مضامین کا یہ مجموعہ "بیل بوٹے" کے نام سے بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔ علاوہ بریں اس سلسلے کی مزید کڑیاں نظموں اور مختلف مضامین کی صورت میں بھی زیر ترتیب ہیں۔

"بیل بوٹے" کے مطالعہ سے مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کا پتہ چلتا ہے۔ ادبی۔ تنقیدی۔ اصلاحی۔ سوانحی مضامین کے علاوہ ترجمہ اور فسانوں وغیرہ مختلف صنف ادب پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ مجموعہ کی نمایاں خوبی دلکش سلاست اور بے تکلف روانی ہے۔ مولانا شبلی کی ادبی حیثیت۔ نواب نصیر حسین خیال۔ سرت بابو۔ نظیر اکبر آبادی وغیرہ نیم تنقیدی سوانحی مضامین ہیں۔ ان مضامین میں مصنف نے اپنے حقیقی جذبات و خیالات کے بے لاگ اظہار کے سلسلہ میں بے باک نگاری سے گریز نہیں کیا۔ اور اپنے تاثرات کو علمی نقطہ نظر سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میرن صاحب کا لطیفہ۔ جمال الدین افغانی اور

داغ کی ملاقات“ ایسے فکاہی چٹکلے ہیں کہ تاریخی حیثیت سے ان بزرگوں کے سوانح حیات میں شامل کئے جانے کے قابل ہیں۔ حدیثِ عشق و سرمستی، جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ۔ ہیئت اجتماعی کی تعمیر۔ ہماری بعض معاشرتی خرابیاں وغیرہ اصلاحی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ اور نرمل گیان قسمت کا پانسہ وغیرہ فسانے ہیں۔

جن لوگوں نے نسیم صاحب کو قریب سے دیکھا ہے یا ان کی نظم و نثر کا گہرا مطالعہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے ناآشنا نہیں کہ ان کی طبیعت میں بلا کی روانی اور ہمہ گیری ہے۔ نظم۔ غزل۔ ناول۔ ڈرامہ۔ فسانہ۔ تنقید ہر موضوع پر بے روک یوں قلم اٹھاتے ہیں کہ سلاست اور سادگی کا دامن ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹتا۔ دقیق الفاظ کا غلبہ ان کی تحریر میں کہیں ایسا نظر نہیں آتا کہ جس سے اجنبیت یا تکلّف کا رنگ طرزِ نگارش پر حاوی ہو سکے۔ ان کی طبیعت بے تکلف سادگی۔ روزمرہ کی چاشنی اور ہندی الفاظ کی موزوں آمیزش کی طرف فزوں تر آمادہ نظر آتی ہے۔ لیکن جہاں تک نسیم صاحب کی ادبی مساعی۔ سے مجھے آگاہی ہے، اس لحاظ سے ”بیل بوٹے“ کے مختلف النوع مضامین اور طرزِ تحریر سے ان کے اصلی رنگِ طبیعت کی صرف ایک ہلکی سی جھلک نظر آ سکتی ہے.... یہ مجموعہ ان کے طرزِ نگارش کی صحیح نمائندگی کے فرائض کی انجام دہی سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ”بیل بوٹے“ زیرِ ترتیب سلسلہ تصنیفات کی صرف ایک تمہیدی کڑی ہے۔ اور ایک ایسا بے تکلف گلدستہ ہے جس سے ہر دیکھنے والا صاحبِ ذوق لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ مجموعہ پبلک اور اربابِ ذوق کی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

بمبئی ۲۴ ؍ اگست ۴۴ء

بشیر احمد میر (بی۔ اے)

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	نمبر صفحہ
۱	نظیر اکبرآبادی	۱
۲	نواب نصیر حسین خیال	۱۰
۳	میرن صاحب کا لطیفہ	۱۷
۴	جمال الدین افغانی اور داغ کی ملاقات	۱۹
۵	ٹیگور کی موت	۲۴
۶	اردو ادب اور مقامی تعصبات	۲۶
۷	نوجوان ارباب قلم	۲۹
۸	مکتوبات شاد	۳۳
۹	سرت بابو	۳۷
۱۰	چراغ	۴۲
۱۱	قیمت حسن	۴۳
۱۲	رسالہ عالمگیر کا روشنی نمبر	۴۷
۱۳	چند تبصرے	۵۲
۱۴	نادر کاکوروی کی شاعرانہ موت	۵۷
۱۵	مولانا شبلی کی ادبی حیثیت	۶۰
۱۶	قسمت کا پانسہ	۶۵
۱۷	نرمل گیان	۷۱
۱۸	ہیئت اجتماعی کی پائیداری	۷۳
۱۹	عورتیں اور اخبار نویسی	۷۷
۲۰	ہوا بازی کی ترقی	۷۹
۲۱	حدیث عشق و سرمستی	۹۰
۲۲	ہندوستان کے نورتن	۹۶
۲۳	ہندوستانی فلم کی ناکامی	۱۰۸
۲۴	علامہ جمال الدین افغانی کا ایک خطبہ	۱۱۱
۲۵	ہماری بعض معاشرتی خرابیاں	۱۲۲

نظیر اکبر آبادی

نظیر کا نام ولی محمد اور وطن مالوف اکبر آباد ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ ان کا مذہب شیعہ تھا۔ لیکن ایسا نام شیعہ حضرات میں نہیں سنا گیا۔ انھوں نے سو برس کی عمر پائی۔ ان کی تصنیفات سے سات کلیات اردو میں موجود ہیں۔ جس طرح وہ اردو کے عالی پایہ ناظم تھے۔ اسی طرح ہندی کے عالی دماغ شاعر آزاد منش اور درویش صفت انسان تھے۔ بہت سادہ طبیعت پائی تھی کبھی کسی دربار میں نہ گئے۔ اگر انھیں فطری شاعر کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا ہمیں یہاں نظیر کی صرف اردو شاعری پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہے اگلے بزرگوں نے شعرا کے بہتیرے تذکرے لکھے لیکن کسی تذکرے میں نظیر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ خیر سے اگر کسی تذکرے میں ذکر آیا بھی تو ایسی نفرت اور خفارت سے گویا وہ شاعر ہی نہ تھے۔ یہ عام طور سے شکایت کی جاتی ہے کہ نظیر کے کلام میں عامیانہ اور سوقیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ ایک حد تک یہ اعتراض صحیح ہے لیکن ضرورت شعر کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال مہمل معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً جہاں کہیں مدارج عمر کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس زمانہ میں جو کچھ واقعات انسان

برگذر سکتے ہیں یا جو حرکتیں انسان سے سرزد ہوسکتی ہیں نظیر نے ان کی صحیح تصویر کھینچدی ہے۔

عالم شیر خوارگی میں جب بچہ دنیاوی تفکرات سے آزاد رہ کر آغوشِ مادر میں پرورش پاتا ہے۔ اس کے متعلق نظیر کے دو بند ملاحظہ ہوں :۔

کیا وقت تھا وہ ہم تھے جب دودھ کے چٹورے　　ہر آن آنچلوں کے معمور تھے کٹورے
پاؤں میں کالے ٹیکے ہاتھوں میں نیلی ڈورے　　یا چاند سی ہو صورت یا سانورے و گورے
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

نے دوستی کسی سے نے دل میں اُنکے کینہ　　جانیں نہ بے قرینا سمجھیں نہ کچھ قرینا
نے گرمیوں سے واقف نے جانتے پسینہ　　چھاتی سے ماں کے لپٹے خوش انکا دودھ پینا
کیا سیر دیکھتے ہیں یہ طفل شیر خورے

جب بچہ اِدھر اُدھر دوڑتا پھرتا ہے۔ ماں کی آنکھیں بچہ کو کھیلتے کودتے دیکھ کر پر نور ہو جاتی ہیں۔ باپ کے دل کو سرور ہوتا ہے۔ اس پاک اور بے لوث عہدِ طفلی کی طرف اشارہ کرتے ہیں :۔

جو کوئی چیز دیوے نت ہاتھ اوڈتے ہیں　　گڑ بیر مولی گاجر لے منہ میں گھونٹتے ہیں
بابا کی مونچھ ماں کی چوٹی گھسوٹتے ہیں　　گردوں میں اَٹ رہے ہیں خاکوں میں لوٹتے ہیں
کچھ مل گیا سو پی لے، کچھ مل گیا سو کھالے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

جو انکو دو سو کھالیں پھیکا ہو یا سلونا　　ہیں بادشہ سے بہتر جب مل گیا کھلونا

جب جا پہ نیند آئی پھر واں ہی ان کو سونا   پروا نہ کچھ پلنگ کی نے چاہیئے بچھونا
بھبونیو کوئی بجائے پھرکی کوئی پھرائے
کیا عیش لوٹتے ہیں معصوم بھولے بھالے

عہد طفلی کے بعد عالم شباب کا دور دورہ ہوتا ہے۔ دل انسان میں نئے نئے ولولے نئی حسرتیں پیدا ہوتی ہیں۔ یہیں سے انسان کی آزمائش کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت جو شخص سنبھل جاتا ہے آئندہ زندگی مسرت سے بسر کرتا ہے۔ نشۂ شباب ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی آنکھوں میں سرسوں پھولی رہتی ہے اچھا برا کچھ نہیں سوجھتا۔ نظیر نے کیسا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

کیا عیش کے رکھتی ہے سب آہنگ جوانی   کرتی ہے بہاروں کے تئیں دنگ جوانی
ہر آن پلاتی ہے مے اور بھنگ جوانی   کرتی ہے کہیں صلح کہیں جنگ جوانی
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی
نے نے کا نہ معجون کے منگوانے کا کچھ غم   نہ دل کے لگانے کا نہ غم کھانے کا کچھ غم
گالی کا نہ آنکھوں کے لڑ آنے کا کچھ غم   ہنسنے کا نہ چھاتی سے لپٹ جانے کا کچھ غم
اس ڈھب کے مزے رکھتی ہے اور ڈھنگ جوانی
عاشق کو دکھاتی ہے عجب رنگ جوانی

مندرجہ بالا اشعار سوقیانہ اور عامیانہ ہی کیوں نہ ہوں لیکن صحیح واقعات ہیں جو آئے دن دنیا میں رونما ہوا کرتے ہیں۔ یہی وہ اخلاق سوز

حرکتیں ہیں جو نوجوانوں کو بوڑھا بنا دیتی ہیں۔ نظیر یہی باتیں صاف اور سیدھی سادی زبان میں ظاہر کر دیتے ہیں۔ جس سے پڑھنے والے کو عبرت ہوتی ہے۔ کاروان سرائے شباب سے گذر کر مسافر عمر صحرائے پیری میں گامزن ہوتا ہے۔ شباب کی رخصت اور پیری کی آمد ہوتی ہے۔ جسے شاعرانہ اصطلاح میں رخصت بہار اور آمدِ خزاں کہتے ہیں۔ اس وقت ہر عضو بدن کمزور، بینائی میں فرق اور دماغ معطل ہو جاتا ہے۔ اور گزرے ہوئے زمانہ کی یاد رہ رہ کے دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ ہر اچھا یا برا گذشتہ کام آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ نظیر اس زمانے کے متعلق یوں فرماتے ہیں :-

کیا قہر ہے یارو جسے آجائے بڑھاپا   اور عیش جوانی کے تئیں کھائے بڑھاپا
عشرت کو ملا خاک میں غم لائے بڑھاپا   ہر کام کو ہر بات کو ترسائے بڑھاپا
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

یاد آتے ہیں ہمکو جو جوانی کے وہ ہنگام   اور جام دل آرام مزے عیش اور آرام
ان سب میں جو دیکھو تو نہیں ایک کا نام   کیا ہم پہ ستم کر گئی یہ گردشِ ایام
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

جو عالم جوانی میں عیاش طبع اور رنگین مزاج واقع ہ

ہیں۔ انھیں بڑھاپے میں بھی عیش و عشرت کا خیال دامنگیر رہتا ہے۔ کسی کے بوڑھا کہنے سے چراغ پا ہو جاتے ہیں بزعم خود اپنے کو جوان سمجھتے ہیں۔ کند ہم جنس با ہم جنس پرواز کا عملی بطلان ملاحظہ ہو۔

بوڑھوں میں اگر جاویں تو لگتا نہیں واں دل   واں کیونکہ لگے دل تو ہے محبوبوں کا مائل
محبوبوں میں جاویں تو وہ سب چھڑکتے ہیں بل بل   کیا سخت مصیبت کی پڑی آن کے مشکل
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

زمانۂ پیری میں بال سفید ہوئے اور خضاب کا استعمال شروع ہوا۔ چند روز کے لئے پیر فرتوت بھی جوان تو نہیں ہاں البتہ مصنوعی جوان ضرور بن جاتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت نہیں چھپتی، نظیر کہتے ہیں:۔

گر حرص سے ڈاڑھی کو خضاب اپنے لگادیں   جھری جو پڑی منہ پہ اُسے کیسے مٹادیں
گو مکر سے ہنسنے کے لیئے دانت بندھاویں   گردن تو پڑی ہلتی ہے کیا خاک چھپادیں
سب چیز کو ہوتا ہے بُرا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مندرجہ بالا اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خضاب کا استعمال ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہے۔ اور دانت بنوانا نظیر کے زمانہ میں رواج پا چکا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شعر میں اس کا ذکر نہ آتا۔

نظیر نے نوجوانوں کو جو نصیحت کی ہے وہ بھی سن لیجئے۔

سنتے ہو جوانو! یہ سخن کہتے ہیں تم سے   کرنے ہوں جو کر لو وہ مزے عیش و طرب کے
جاویگی جوانی تو پھر افسوس کرو گے   تم جیسے ہو ویسے تو کبھی ہم بھی جواں تھے
سب چیز کو ہوتا ہے برا ہائے بڑھاپا
عاشق کو تو اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

بڑھاپے کی عاشقی پر چند بند ملاحظہ ہوں۔ وہ بڈھے پھونس جن کے منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت لیکن نشۂ عشق میں سرشار ہیں۔ ایسے بوالہوسوں کی حالت نظیر مرحوم کیسے ظرافت آمیز اور موثر پیرایہ میں بیان فرماتے ہیں۔

قائم ہے جسم گو کہ نہیں کس غنیمت است   جیتے تو ہیں اگرچہ نہیں بس غنیمت است
سو عیش ہمکو گر نہ ملے دس غنیمت است   وقتِ خزاں جو گل نبود خس غنیمت است
پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
وز شاخِ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

طاقت بدن میں کہیئے تو اب نام کو نہیں   ہوتا ہے اب بھی سیر تماشا اگر کہیں
جاتے ہیں لاٹھی ٹیک کے دلشاد ہم وہیں   جو ہمکو دیکھتا ہے وہ کہتا ہے آفریں
پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
وز شاخِ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

روئے جو ہم چمن میں سحر بیٹھ کر ذرا   بلبل نے پوچھا گل سے کہ "بوڑھا یہ کیوں رو دیا"
اس نے کہا کہ اسکا کسی سے ہے دل لگا   تب گل نے ہمکو دیکھ کے ہنس کر یہی کہا

پیرے کہ دم ز عشق زند بس غنیمت است
وز شاخ کہنہ میوۂ نورس غنیمت است

یوں تو بہار کی تصویر بہت سے شعرا نے کھینچی ہے لیکن نظیر کا انداز سب سے نرالا ہے۔

شب کو چمن میں واہ وا کیا ہی بہار تھی مچی
پھول کھلے تھے پھول پھول غنچے کھلے کلی کلی
بیلا چنبیلی رائے بیل موتیا جوہی سیوتی
باد صبا بھی چلتی تھی عطر و گلاب میں بسی
حوض تٹے چھلکتے تھے نہر ہلوریں لیتی تھی
شوخ بغل میں غنچہ لب مے کے نشوں کی تازگی
عیش و طرب کی لہر میں رات جب آدہی ڈھلگئی
اسمیں کسی سے ہے غضب نکلی جو کر چاندنی
صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

رات تو کیا ہی عیش کی ٹھیری تھی آکے انجمن
تارے کھلے تھے مہ رتن پھول کھلے چمن چمن
نرگس انار و یاسمن سوسن و طرے نسترن
سینہ بسینہ تن بتن عیش و طرب کھچے سب بدن
اسمیں رقیب دلشکن آیا گجر کا کرکے فن
تھالی کہیں سے لا شتاب دی ہی بجا ٹھن ٹھنن
صبح کے ڈر سے ہڑبڑا یار نے گھر کی راہ لی
ہم بھی دغا میں آ گئے مفت بہار لٹ گئی

برسات کا کیسا اچھا نقشہ کھینچا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا بجلی چمک رہی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ مینھ برستا ہے۔ حشرات الارض اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ لفظوں میں موسیقیت بھر دی ہے جو کانوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے

چند اشعار درج ذیل کرتا ہوں۔

چار طرف سے ابر کی واہ اٹھی تھی کیا گھٹا   بجلی کی جگمگاہٹیں رعد رہا تھا گڑ بڑا
برسے تھا مینہ جھوم جھوم چھاجوں اُنڈا امنڈ پڑا   جھکے ہوا کے چل رہے یار بغل میں لوٹتا
ہم بھی ہوا کی لہر میں پیتے تھے مے بڑھا بڑھا   دیکھ ہمیں اس عیش میں سینہ فلک کا پھٹ گیا

ابر کھلا ہوا گھٹی بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہ گئی

ابر و ہوا کے واہ واہ سب کو عجب سرور تھے   بھیگ رہا تھا سب چمن مینہ کے جھڑاکے زور تھے
کوک پپیہے مور تھے جھینگروں کے بھی شور تھے   بادہ کشی کے دور تھے عیش و طرب کے جوڑ تھے
باغ سبز تھا باغباں جتنے تھے شوربور تھے   آ پڑے اس میں ناگہاں یہ جو خوشی کے چور تھے

ابر کھلا ہوا گھٹی بوندیں تھمیں سحر ہوئی
پہلو سے یار اٹھ گیا سب وہ بہار بہ گئی

ابھی تک اس مضمون میں جتنے اشعار درج کئے گئے ہیں ان میں چند الفاظ غیر مانوس اور متروک نظر آئیں گے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ نظیر کے معاصرین کے یہاں جا بجا یہ سب لفظ ملتے ہیں اور وہ اس زمانہ میں مروج تھے۔ یہ بھی یہاں لکھ دینا ضروری امر ہے کہ جو شعر کلیات میں جس طرح درج تھا۔ اسی طرح درج کر دیا گیا ہے۔ اور کسی قسم کا تصرف نہیں کیا گیا۔

نظیر نے اردو میں نیچرل شاعری کا سنگ بنیاد رکھا ہے اس لحاظ سے اگر انھیں نیچرل شاعری کا بانی کہا جائے تو نامناسب

نہ ہوگا۔

نظیرؔ کا کلام ہم یورپ کے بڑے سے بڑے شاعر کے بمقابلہ میں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن ہندوستاں کی ناقدرشناسی ضربُ المثل ہے ہمیں زیادہ افسوس اس امر کا ہے کہ نظیرؔ کی جیسی عزت ہمیں کرنی چاہیئے تھی وہ سب سے پہلے اردو داں سخن فہم یوروپین طبقہ نے کی اور ہندوستانیوں کو نظیرؔ کی عزت کرنا سکھلایا۔ اس لحاظ سے ہمیں ان کا شکرگزار ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد مولانا شہباز مرحوم بہاری اور مرزا مخمور اکبر آبادی کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے۔ جنھوں نے نظیرؔ کی مفصل سوانح عمری لکھی اور نظیرؔ کی شاعری پہ فاضلانہ تبصرہ کیا۔ اور کلام کا انتخاب کر کے اردو داں طبقہ پر زبردست احسان کیا۔

نظیرؔ کے کلام میں کئی خصوصیات ہیں۔ انھوں نے اس عالمِ فانی میں جو کچھ دیکھا اسے نظم کر دیا۔ کلام میں سوا چند مقامات کے کہیں تصنع نہیں معلوم ہوتا۔ حالانکہ وہ ایسے زمانہ کے شاعر ہیں جب کہ بغیر تصنع اور بعید الفہم تشبیہوں اور استعارات کے شعر پھیکا معلوم ہوتا تھا۔ نظیرؔ نے قریب الفہم تشبیہیں اور استعارے استعمال کئے ہیں ملاحظہ ہو:۔

اس سیہ ابر میں یوں اڑتے ہیں بگلے جیسے — لبِ مالیدہ مسی میں دُرِ دنداں کی چمک
جگنو اس طرح چمکتے ہیں کہ جوں وقت سنگار — ماتھے پر ہاتھی کے گویا سنگرف ہے چھڑکا
مور کا شور، فغاں غوک کی جھینگر کی پکار — پی پی ہر آن پپیہے کی ہے، کوئل کی صدا

کیسی دل کش تشبیہیں اور پُر تاثیر مصوری ہے۔ ایک شعر جرأت کے رنگ میں ہے۔ نزاکتِ معشوق ملاحظہ ہو:۔

آغوشِ تصور میں جب ہم نے اُسے مسکا
لبہائے نزاکت سے اِک شور تھا بس بس کا

جُرأت کا شعر یہ ہے۔

ڈر ہے کمرِ یار کہیں ٹوٹ نہ جائے
آغوشِ تصور میں دبانا نہیں اچھا؛

خدا وہ دن لائے کہ ہندوستان نظیرؔ کی ایسی عزت کرے جو اس کے شایانِ شان ہو۔

(رسالہ "زمانہ" کان پور اگست سنہ ۱۹۲۶ء)

نواب سیّد نصیر حسین خیالؔ مرحوم

وِلادت

نواب سید نصیر حسین خیالؔ مرحوم سنہ ۱۸۸۰ء میں پٹنہ عظیم آباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدِ بزرگوار کا نامِ نامی میر نوروز حسین تھا، اور اپنے زمانے میں چوٹی کے رؤسا میں شمار کئے جاتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ عظیم آباد میں ہر علم و فن کا ماہر موجود تھا۔ اور اس خراب آباد میں ہر طرف سخن برستا تھا۔ نواب خیال کا خاندان ہمیشہ سے اپنے علم و فضل اور دولت و ثروت کے اعتبار سے بنگال اور بہار میں معزز و محترم سمجھا جاتا تھا۔ خیالؔ نے

جن لوگوں کی گود میں پرورش پائی وہ سب صاحبِ علم اور علم دوست تھے۔ آپ قدرت کی طرف سے ذہانت و طباعی کا خداداد جوہر لے کر آئے تھے اور ادبی ذوق ازل سے ان کے خمیر میں شامل تھا۔

تعلیم

آپ نے اردو فارسی اور عربی کی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ اس کے بعد شہر کے ایک انگریزی اسکول میں داخل کر دیئے گئے اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ آپ کے بچپن کے دوست مرزا ابو محمد صاحب طالبؔ عظیم آبادی سے مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ نواب صاحب نے کسی زمانے میں منشی فاضل کا امتحان دیا تھا، اور اس میں کامیاب ہونے کے بعد ایف۔ اے کا امتحان بھی پاس کیا تھا۔

شاعری سے شوق

خیال مرحوم کے بچپن میں پٹنہ عظیم آباد شعرا کا ملجیٰ و ماویٰ بنا ہوا تھا۔ خان بہادر مولانا علی محمد شادؔ عظیم آبادی آپ کے حقیقی ماموں تھے۔ اِس زمانے میں لکھنؤ اجڑ چکا تھا اور عظیم آباد، آباد تھا۔ لکھنؤ اور ہندوستان کے باکمال شعراء عظیم آباد آتے اور اپنے کمالِ فن کی داد پاتے نواب صاحب نے بھی شعر کہنا شروع کیا اور اپنے ماموں مولانا شادؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ لیکن کچھ زمانہ گذرنے کے بعد شاعری چھوڑ دی اور نثر کو اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا۔

نثر نگاری

اس زمانے میں "حبل المتین" (کلکتہ) کے شہرۂ آفاق

ایڈیٹر علامہ سید جلال الدین موید اسلام ایران سے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے ہوئے پٹنہ تشریف لائے اور خیال مرحوم کے والد گرامی کے یہاں ہوئے پہلی ہی ملاقات میں نواب صاحب پر موید اسلام کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ آخر عمر تک وہ اس باکمال ہستی کے قائل رہے۔ چنانچہ جب موید اسلام نے کلکتہ سے "حبل المتین" نکالا تو خیال مرحوم پٹنہ میں اس کے ایجنٹ قرار پائے۔

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مولانا شاد عظیم آبادی خیال مرحوم کے حقیقی ماموں تھے۔ اس لئے آپ کے یہاں شعر و ادب کا چرچا رہتا تھا خیال بھی ان صحبتوں سے مستفید ہوتے تھے۔ انھیں ایام میں مولانا شاد کے مشہور شاگرد سید علی سجاد عظیم آبادی صاحب "محل خانہ" و "نئی نویلی" سے خیال کے دوستانہ روابط قائم ہو گئے۔ علی سجاد ازل سے اردوئے معلی کا ذوق لے کر آئے تھے۔ خیال کو آپ کی صحبتوں سے بے حد فائدہ پہونچا اور طبیعت پر ایسی جلا ہوئی کہ خود انشاپردازی میں ایک خاص اندازِ تحریر کے مالک کہلائے۔

پٹنہ سے ادیب کا اجرا

اسی زمانے میں پٹنہ سے ایک شاندار ماہانہ رسالہ "ادیب" جاری ہوا۔ اس رسالے کی عنانِ ادارت نواب خیال کے بھائی سید محمد اور خیال مرحوم کے ہاتھوں میں تھی اور اس کی نگرانی علی سجاد فرماتے تھے۔ اس رسالے میں

اس دور کے بنگال و بہار کے مشہور اہلِ قلم کے مضامین نثر و نظم شائع ہوتے تھے۔ سب سے پہلے خیال مرحوم کے مضامین اسی رسالے میں چھپنے شروع ہوئے اس کے بعد "اودھ پنچ" اور بعض دوسرے اخبارات و رسائل میں بھی بعض مضمون شائع ہوئے۔

شادی

ابھی آپ کی انشا پردازی کا ابتدائی زمانہ ہی تھا کہ آپ کی شادی مٹیا برج کلکتہ کے ایک معزز خاندان میں ہو گئی اور آپ نے شادی کے بعد مستقل طور پر کلکتہ ہی میں سکونت اختیار فرمالی۔

کلکتہ میں نواب صاحب کو موید اسلام کی بابرکت صحبتوں میں حاضر ہونے کا ہمیشہ موقع ملتا رہا اور موید اسلام کے فیضِ صحبت سے آپ کی طبیعت پر ایسی جلا ہوئی کہ جوہرِ ذاتی چمک اٹھا۔ اس زمانے میں آپ نے فارسی میں کئی مضامین لکھے۔ جو مختلف ناموں سے "حبل المتین" میں شائع ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ رسالہ "حسن" حیدرآباد، العصر، اولڈ بوائے، جادو، جامعہ۔ علی گڑھ میگزین، ندیم، نقیب، آفتاب، اور کارواں وغیرہ میں آپ کے مضامین آخر دم تک چھپتے رہے۔

داستانِ اردو

آپ نے اردو زبان کی ایک مبسوط اور مفصل تاریخ "داستانِ اردو" کے نام سے لکھنی شروع کی تھی یہ شاندار تصنیف موت سے پہلے پایۂ تکمیل کو پہونچ چکی تھی اور اس کا ایک حصہ "مغل اور اردو" کے نام سے چھپ کر علمی

حلقوں میں مقبول ہو چکا ہے۔ آپ نے میر انیس پر بھی ایک مفصل کتاب لکھی تھی، خدا جانے آپ کی موت کے بعد اس بلند پایہ تصنیف کا کیا حشر ہوا۔ میں نے اس تصنیف کے جستہ جستہ مقامات دیکھے تھے، اس میں نواب صاحب نے نہ صرف انیس اور ان کے خاندان کے حالات ہی قلمبند کئے تھے۔ بلکہ اردو مرثیے پر ایسی سیر حاصل بحث کی تھی کہ اس کی نظیر اردو لٹریچر میں کہیں نہیں ملتی۔ اگر آپ کی یہ تصنیف شائع ہو جاتی تو اردو لٹریچر کو بہت فائدہ پہونچتا۔

اردو کانفرنس کی صدارت

۱۹۱۶ء میں آپ نے آل انڈیا اردو کانفرنس لکھنؤ کے صدر کی حیثیت سے جو خطبہ پڑھا تھا وہ اس زمانے کے مختلف اخبارات اور رسائل میں چھپنے کے علاوہ علیحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا تھا۔ جو اس قدر جامع پُرمغز اور تفصیلی تھا کہ سارے ہندوستان میں آپ کی شہرت ہو گئی آپ کی موت سے ایک سال پہلے "محمڈن لٹریری سوسائٹی" کلکتہ کی سرپرستی میں انڈین میوزیم ہال میں حضرت آغا حشر مرحوم کی صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا جس میں آپ نے "شاہنامہ فردوسی" پر ایک مبسوط اور مدلل مضمون پڑھا تھا۔ آپ کا یہ مضمون کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے (کنول بک ڈپو سے طلب فرمائیے) مختصر یہ کہ آپ نے ایسے سیکڑوں مضمون لکھ ڈالے۔ لیکن مستقل تصانیف کی حیثیت سے اب تک

صرف "مغل اور اردو" اور "شاہنامۂ فردوسی پر تبصرہ" دو کتابیں شایع ہوئی ہیں۔

شعرا کا احترام

آپ اردو شعرا میں میر انیس، امام الشعرا میر، خواجہ میر درد، آتش اور شاد عظیم آبادی کو دوسرے شعرا کی نسبت زیادہ پسند کرتے تھے۔

یورپ کا سفر

آپ اردو فارسی، عربی اور انگریزی کے علاوہ فرانسیسی زبان سے بھی کما حقہ آگاہ تھے۔ فرانسیسی زبان یورپ کے زمانۂ قیام میں سیکھی تھی۔ یورپ سے واپسی کے بعد آپ نے جو مزاحیہ مضامین لکھے ان میں صاف طور پر فرانسیسی طرزِ انشاپردازی کی جھلک پائی جاتی ہے۔ اس کی روشن مثال آپ کا مشہور مضمون "ہمارے پانچ ملک الشعرا" ہے جو آفتاب کلکتہ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہو کر عام طور پر مقبول ہو چکا ہے۔

طرزِ تحریر کی بلندی

نواب صاحب کی تحریروں میں جا بجا رعایت لفظی و معنوی کا اہتمام نظر آتا ہے انھوں نے جو لفظ جس جگہ لکھدیا ہے اگر اس لفظ کا ہم معنی دوسرا لفظ وہاں رکھدیا جائے تو ہرگز وہ لطف نہیں آ سکتا۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ آپ کا اپنا خاص اندازِ تحریر ہے۔ جس کے موجد بھی خود ہی ہیں۔

اخلاقی بلندی اور وضعداری

نواب صاحب کی

ابتدائی تعلیم و تربیت ایسی فضا میں ہوئی تھی جو سرتاسر مشرقی تھی۔ لیکن کلکتہ کے قیام اور یورپ کی سیر نے آپ کی طرزِ بود و ماند پہ کافی اثر ڈالا تھا۔ انھیں بظاہر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی "مغرب زدہ" انسان ہیں۔ لیکن آپ کے سینے میں ایک خالص مشرقی دل تھا۔ انسان کی حیثیت سے آپ ایک بلند انسان، اور وضعداری میں اپنی مثال آپ تھے۔ آپ جس سے ایک مرتبہ جس طرح ملے۔ ہمیشہ اُسی طرح نباہنے کی کوشش کی۔ ان کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتی تھیں خاص طور پر گذشتہ نصف صدی کی سیاسی تحریکات اور ہندوستان کے متعدد ادبا و شعرا کے متعلق آپ کو ہزارہا ایسے واقعات یاد تھے کہ اگر آپ انھیں قلمبند فرماتے تو ان سے ہندوستان کے ادب و سیاست کو بے حد فائدہ پہونچتا۔

نواب صاحب کی یادگار

آپ کی یادگار آپ کے ایک صاحبزادے ہیں۔ جن کا نام سید امیر نواب ہے۔ کلکتہ میں رہتے ہیں اور ابھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ آپ اپنے جلیل القدر باپ کے نقشِ قدم پہ چل کر اپنے خاندان کا نام روشن کریں گے۔

انتقال

دسمبر ۱۹۳۴ء میں نواب صاحب اپنے دوست نواب سر احمد سعید خاں صاحب والئی چھتاری سے ملنے چھتاری تشریف لائے تھے۔ ۱۲ر دسمبر کی بات ہے کہ باغ میں گلگشت

کرتے ہوئے بالاخانے پر چڑھ رہے تھے۔ یکایک دل میں درد اٹھا آپ زینے پر بیٹھ گئے اور اسی وقت انتقال فرما گئے۔

خیال کی موت اردو لٹریچر، ہندوستان کی اعلیٰ سوسائٹی اور خیال کے جاننے والوں کے لئے ایک ایسا صدمۂ جانکاہ ہے۔ جس کی تلافی قیامت تک نہ ہو سکے گی ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

”کنول اگست ۱۹۳۵ء“

میرن صاحب کا لطیفہ

مرزا غالب کی شوخیِ تحریر کا کون سا ایسا فریادی ہوگا جو ان کے چہیتے شاگرد میرن صاحب کے نام سے واقف نہ ہو۔ یہ وہی میرن صاحب ہیں جن کے نام رقعاتِ غالب میں کئی مکتوب موجود ہیں۔ غدر میں جب دلی اجڑی تو اس اجڑے دیار کے بچے کھچے باکمال ملک کے مختلف گوشوں میں بکھر گئے۔ مگر مرزا غالب کی طرح میرن صاحب بھی فاقوں پر گزارہ کرتے اور اپنی وضعداری نباہتے دلی ہی میں مقیم رہے۔ غالب کے انتقال کے بعد جب دلی میں ان کی دلبستگی کا کوئی سامان باقی نہ رہا

تو انھوں نے برداشتہ خاطر ہو کر حیدرآباد کا رخ کیا۔ اس مینو سواد میں لوگوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، اور کچھ ماہانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔

میرن صاحب کو غالب کے متعلق ہر چیز اس قدر تفصیل کے ساتھ یاد تھی کہ شاید کسی کو بھی اتنی تفصیل سے یاد نہ ہو۔ غالب سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جس کی مثال بہ مشکل ڈھونڈے سے کہیں مل سکتی ہے۔

ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک نواب صاحب نے غالب کا کوئی شعر غلط پڑھ دیا۔ اتفاق سے وہاں **میرن صاحب** بھی موجود تھے۔ وہ غلط شعر سنتے ہی بھڑک اٹھے۔ اور کڑک کر فرمایا۔ کیا اسے قرآن حدیث سمجھ رکھا ہے کہ جیسا جی میں آیا پڑھ دیا۔ حضرت یہ غالب کا کلام ہے اسے غلط نہیں پڑھتے۔ اور اس کے بعد پھر خود صحیح شعر پڑھ کر سنا دیا۔

"سماج بمبئی سنہ ۳۷ء"

سیّد جمالُ الدّین افغانی

اور

حضرتِ داغ کی ملاقات

سیّد جمال الدین اسد آبادی المعروف بہ افغانی انیسویں صدی کے ان رجال تاریخی میں سے تھے جن کی نظیر مدتوں زمانہ پیدا نہ کرسکے گا۔ ان کی زندگی کا مشن یہ تھا کہ مشرق کو اہلِ مغرب کی زبردست گرفت سے نجات دلائی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اتحادِ اسلام کے نام سے ایک زبردست تحریک کی بنیاد ڈالی لیکن اس مہتم بالشان تحریک سے ان کا مقصد یہ تھا کہ تمام اقوامِ مشرق کو بیدار کرکے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے۔ اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہوسکتا ہے کہ اگر ان کا یہی مقصد تھا۔ تو پھر انھوں نے اپنی تحریک کا "اتحادِ اسلام" نام کیوں رکھا؟ - اس کی وجہ اس زمانہ کی تاریخ دیکھنے اور مختلف اقوام کی حالت کا جائزہ لینے سے ظاہر ہوجائے گی۔ ہر زمانہ کے واقعات و حالات جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان ہی کے تحت کوئی تحریک جاری کی جاتی ہے۔ جس عہد میں سید جمال الدین

نے تحریک "اتحادِ اسلام" کا سنگِ بنیاد رکھا تھا۔ اس وقت مشرق کی تمام اقوام ذلّت و نکبت کے آخری زینہ پر پہونچ چکی تھیں۔ اگرچہ ایران، افغانستان، ترکی، مصر، عرب وغیرہ میں بھی مغربی ریشہ دوانیوں کا بازار گرم تھا۔ مگر یا تو ان میں سے بعض ممالک یکسر آزاد اور اپنی قومی حکومت کے زیرِ سایہ تھے یا بعضے نیم آزاد ضرور تھے۔

سید مرحوم کا مقصد یہ تھا کہ پہلے ان بیدار اور نیم بیدار ممالک کو ایک مرکز پر لایا جائے اور اس کے بعد دوسرے سونے والوں کو جھنجھوڑ کر جگا دیا جائے۔ یہ سچ ہے کہ آج سیّد کی عظیم الشان تحریک کا کوئی نام لیوا موجود نہیں، لیکن "اتحادِ مشرق" یا "اتحادِ ایشیا" وغیرہ مشہور تحریکوں کی بنیاد "اتحادِ اسلام" کے ٹوٹے ہوئے کھنڈروں پر قائم ہے اور یہ حقیقت ہے کہ مشرق میں سیاسی بیداری کی اوّلین محرک سیّد علیہ الرحمۃ ہی کی ذات ستودہ صفات ہے۔ آج ایران، ترکی اور مصر کے بچے بچے کی زبان پر سید کا نام ہے اور ان میں سے ہر ایک سید کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت یا ان کے خیالات نے اتنے بلند مرتبہ اکابر پیدا کر دیے کہ اُن کے نام تاریخِ عالم میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

انور پاشا، مہدی سوڈانی، شیخ سنوسی، مفتی محمد عبدہ، سعد زاغلول پاشا، آقائے موید الاسلام، سید رشید رضا وغیرہ اکابر و اعاظم کون ہیں؟ یہ سب اسی منبعِ فیض سے نکلی ہوئی مختلف شاخوں کے

The J & K University Library
Acc. No. 24844

نام ہیں۔

جس زمانہ میں سید علیہ الرحمۃ کلکتہ میں رونق افروز تھے۔ آپ کی ملاقات کو اکثر عمائد شہر آیا کرتے، اور آپ کے افکار و خیالات سے روح کے لئے سامانِ بالیدگی پاتے تھے۔ اسی زمانہ میں جہاں استاد داغ دہلوی بھی کلکتے میں مقیم تھے۔ "اخترِ بیا" کی آمد نے مشاعروں کی محفلوں میں از سرِ نو زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ مرزا غالب اور شاگردانِ قتیل کی معرکہ آرائیوں اور مرزا کے منہ سے "بادِ مخالف" سننے والوں کی ہند کے اس سابق دارالسلطنت میں کوئی کمی نہ تھی۔ باہر سے جو کوئی شاعر آتا لوگ اسے سر آنکھوں پر بٹھاتے اور دلوں میں جگہ دیتے تھے۔ اس وقت کلکتہ خود اردو کا ایک مرکز تھا۔ اس عہد کے مشاعروں کو جن بزرگوں نے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ شاعرے مشاعرے نہیں بلکہ اچھے خاصے میلے ہوتے تھے۔

مرزا داغ بھی ہماری قدیم شاعری کی آخری یادگار تھے۔ انھیں نئی روشنی کی ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ان کی ساری زندگی اگلے بزرگوں کی خلوص اور محبت و مودت سے بھری ہوئی محفلوں میں کٹ چکی تھی۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ۵۷ء کا معرکۂ قتال اور اس کے بعد قتل و غارتگری کے واقعات گذر چکے تھے، وہ اپنی آنکھوں سے محلوں میں بسنے والوں کو فرشِ خاک پر آرام کرتے اور خاک نشینوں کو عرش آشیاں دیکھ چکے تھے۔ غدر کے پہلے وہ ذوق و غالب، امام بخش صہبائی و مومن جیسے

اساتذہ کی صحبتوں سے فیض یاب ہو چکے تھے، دہلی کے بعد رامپور میں امیر بحر اور تسلیم جیسے بزرگوں سے بھی ہم بزمی رہ چکی تھی۔ دکن میں وہ شہر یارِ دکن کے استاد اور امراء کی محفلوں میں زینتِ محفل تھے۔ عظیم آباد اور کلکتہ میں بھی انھیں جن بزرگوں کی صحبتوں میں گرمیٔ محفل بننے کا موقعہ ملا، وہ گگی تہذیب و تمدن کے علمبردار تھے۔ ان تمام واقعات و حالات نے ان کی شاعری کو پرانی روش سے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا۔

سید جمال الدین کوئی معمولی انسان نہ تھے کہ ان کی آمد کی خبر کسی کے کانوں تک نہ پہونچتی۔ سید مرحوم کے کلکتے کے دورانِ قیام میں ان کے علم و فضل، دانش و تدبر اور عظمت و جلال کا تذکرہ جگہ جگہ تھا، شدہ شدہ یہ خبر جہاں استاد کے کانوں تک پہنچی۔ ان کے دل میں بھی سید سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔

آخر کئی دنوں کے بعد آپ سید علیہ الرحمۃ کی قیام گاہ پر پہنچے مگر یہاں نہ کوئی سامانِ تکلف تھا نہ روایتی تصنع۔ چند لوگ بیٹھے ہوئے کسی خشک ... اجتماعی مسئلہ پر گفتگو کر رہے تھے۔ سید مرحوم سے مرزا داغ کا تعارف کراتے ہوئے ایک صاحب نے بتلایا کہ آپ عہدِ حاضر کے سب سے بڑے ہندوستانی شاعر اور شہر یارِ دکن کے استاد ہیں، اور اپنی شیوا بیانی اور وجد آفریں نغمہ سنجیوں کی بدولت اطراف و اکناف ہند میں بلبلِ ہند کہلاتے ہیں۔

تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد سید جمال الدین

نے حضرت داغ سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ حضرت مرحوم اپنا کلام سناتے رہے۔ سید اسد آبادی چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سید مرحوم جیسے مصلح اعظم کو بھلا گل و بلبل کی فرسودہ حکایتوں اور ہجر و وصل کے پیش پا افتادہ فسانوں میں کیا خاک لطف آتا؟ وہ تو ایک سیاسی انسان تھے۔ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے شاعر کے منہ سے وہ نغمے سننا چاہتے تھے جو دلوں میں گرمی پیدا کر دیں اور روحوں کو تڑپا دیں۔ وہ تو سمجھے ہوئے تھے کہ داغ کے پردے میں فردوسی اور ہومر بولتے ہوں گے۔ لیکن یہاں معاملہ بالکل برعکس تھا۔

داغ مرحوم کلام سنا چکے تو کچھ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔ لیکن سید مرحوم کے چہرے پر اب تک پژمردگی اور مایوسی کے آثار نمایاں تھے۔ آپ خاموش تھے اور کسی گہرے سوچ میں پڑے ہوئے تھے۔

حاضرین میں سے ایک صاحب نے اس بے محل خاموشی کا سبب دریافت کیا۔ سید مرحوم نے ٹھنڈی سانس بھر کر ایک رباعی کہی۔ اس کا ایک مصرعہ آج تک کلکتہ میں اکثر بزرگوں کی زبانوں پر ہے افسوس کہ باوجود تجسس کے پوری رباعی ہاتھ نہ آسکی۔ وہ مصرعہ یہ ہے

بجائے اسپ خر را داغ کردند

(رسالہ آئینہ کلکتہ اکتوبر ۱۹۳۲ء)

ٹیگور کی موت پر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ٹیگور کی موت کے ساتھ ادبِ ہند کا وہ زرّیں دور ختم ہوتا ہے۔ جس کا سلسلہ کالیداس سے شروع ہو کر اقبالؔ تک پہونچا ہے۔ ٹیگور نے جب ہوش سنبھالا تو دنیا ایک نئے سانچے میں ڈھل رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ گیرودار میں جاگیردارانہ تہذیب کی شکست اور حرفتی تہذیب کی فتح کا اعلان ہو چکا تھا۔ فرانس میں روسو نے انسانیت کے حقوق اور انفرادی آزادی کی جو صدا بلند کی تھی اس کی بازگشت سات سمندر پار ہندوستان میں بھی سنی جانے لگی تھی۔ اِدھر بنگال میں برہمو سماج کی تحریک زوروں پر تھی۔ بنگال کے اکثر تعلیم یافتہ خاندان دھڑا دھڑ اس تحریک میں شامل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ خود ٹیگور کے خاندان کے بعض افراد اس تحریک کی روحِ رواں بن چکے تھے۔ چنانچہ ٹیگور کا اس تحریک سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ یہی سبب ہے کہ وہ انسانی آزادی اور انفرادیت کا اس شدومد سے حامی نظر آتا ہے۔ اس پر ہندو ویشنوی اور انگریز رومانی شاعروں

کے مطالعہ نے اس کی حساس طبیعت پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ اور بار بار ہمالیہ کی سیر نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ اور اب اس کے دل سے نغموں کی وہ سوت پھوٹ نکلی جس نے ساری دنیا کو حیرت میں ڈال دیا مگر غلام آباد ہندوستان نے اپنی چیزوں کو دوسروں کی آنکھوں سے دیکھنے کا عادی بن چکا ہے۔ اس کی حقیقی عظمت کو اس وقت جانا۔ جب یورپ سے اس کی نظموں کے ایک مجموعہ "گیتان جلی" کے ترجمہ پر اُسے نوبل انعام عطا کیا گیا۔

ٹیگور شاعر ہونے کے علاوہ بہت اچھا افسانہ نگار، باکمال ناول نویس، شاندار ڈرامہ نگار، صاحب نظر ماہر تعلیم اور روشن خیال مصلح بھی تھا۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دور حاضر میں سارے ہندوستان کے اندر ایسی ہمہ گیر طبیعت رکھنے والا ایک شخص بھی موجود نہ تھا۔ مگر اس کی شاعرانہ حیثیت اس کی دوسری تمام حیثیتوں سے زیادہ ممتاز اور اونچے مقام پر ہے اور شاید یہی چیز اس کو بقائے دوام بخشے گی۔

افسوس کہ اس وقت سارے ملک پر نظر ڈالنے کے باوجود ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا۔ جو ٹیگور کی جگہ لینے کا اہل ہو اور آئندہ بھی امید نہیں کہ اس دیس کی خاک سے پھر کوئی ٹیگور جیسا آسمان جاہ شاعر اُٹھے گا۔ جس کے نغمے انسانی روح کو خوابوں کی اس وادی میں لے جا سکیں گے۔ جہاں زندگی بجائے خود حسن و نغمہ کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اب زندگی فطرت کے نگارخانے کو چھوڑ کر ذرائع تجارت

کلبوں اور سینما گھروں کی دلدل میں پھنس چکی ہے۔ اور لطیف و نازک انسانی جذبات مشینوں کے گرما گرم پہیوں میں کچل کر فلم ریڈیو اور اخباری ادب کی شکل میں تبدیل ہو چکے ہیں!!!

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف ایاز میں

(عندلیب بمبئی، ۱۱ اگست ۳۱ء)

اردو ادب اور مقامی تعصبات

انگریزی تہذیب کے جو غلط اثرات اہل ہند پر پڑے ان میں سے ایک مقامی تعصب ہے۔ اب یہ تعصب نہ صرف ہماری معاشرتی و سیاسی زندگی ہی میں سرایت کر گیا ہے بلکہ اس کے نامبارک جراثیم ہماری علمی زندگی کے رگ و ریشہ میں بھی سرایت کر چکے ہیں۔ میرے خیال میں "اردو ادب" کے زیادہ ترقی نہ کر سکنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ فرض کر لیجئے کہ ایک شخص کا تعلق بنگال یا مدراس سے ہے اور وہ اردو زبان کا بڑا اچھا انشا پرداز یا شاعر ہے تو اسے یو۔ پی۔ دہلی اور پنجاب کے لوگ محض مقامی یا وطنی تعصب کی وجہ سے کوئی اہمیت نہ دیں گے۔ اسی طرح سے اگر ایک شخص کشمیر یا سرحد کا باشندہ ہے اور وہ ہماری

زبان کا بڑا اچھا ادیب ہے تو اس کی تحریروں کو یو۔ پی دہلی اور پنجاب کے لوگ یہ کہہ کر پائے استحقار سے ٹھکرا دیں گے کہ کشمیری اور سرحدی کو اردو کس طرح آ سکتی ہے؟ حالانکہ ایسا کہنے والے یہ نہیں سوچتے کہ اب اردو سارے ہندوستان میں عام ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں ان علاقوں کے اردو ادبا جہاں اردو نہیں کے برابر ہے۔ ان علاقوں کے ادبا کی نسبت جہاں اردو عام ہے اور زیادہ مستحق مبارکباد ہیں کہ ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کرنے کے باوجود کہ جہاں اردو کا کوئی خاص چرچا نہیں اتنی اچھی اردو لکھ لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو اشخاص اس قسم کے تعصبات کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں وہ دوستی کے پردے میں اپنی ملکی زبان سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اگر ان لوگوں سے پوچھا جائے کہ تم جو لٹریچر پیدا کر رہے ہو آیا وہ صرف اپنے صوبے کے اردو پڑھنے والوں کے لئے ہے یا دنیا کے تمام اردو خواں اصحاب کے لئے تو وہ فوراً بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ جو ادیب بھی کسی زبان میں کچھ لکھتا ہے وہ اُس زبان کے تمام پڑھنے والوں کے لئے ہوتا ہے نہ کہ کسی ایک مقام یا صوبے کے باشندوں کے لئے۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ بعض خاص حالتوں اور خاص صورتوں میں ایسی ضرورت بھی پیش آئی ہو۔ مگر اس کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "آرٹسٹ" ہمیشہ زمان و مکان کے تعینات سے بالاتر ہوتا ہے۔ آرٹ کا مقصد حسن کی تلاش ہے۔ آرٹسٹ خواہ ہندوستان کا باشندہ ہو یا انگلستان کا، فرانس کا باشندہ ہو یا امریکہ کا اگر وہ صحیح معنوں

میں آرٹسٹ ہے تو اس کا نقطۂ نظر ہمیشہ بین الاقوامی ہوگا۔ وہ وطن، مذہب اور قوم ہر چیز سے بالاتر ہوتا ہے اور اس کا پیغام کسی ایک ملک اور کسی ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام عالمِ انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔ کالیداس کو مرے ہوئے مدتیں گزر گئیں مگر وقت کا ہاتھ شکنتلا کو نہ مٹا سکا۔ عرصہ ہوا کہ شکسپیئر ملکِ عدم کو سدھارا مگر ہیملٹ کو زمانے کا سخت سے سخت جھونکا بھی اپنے ساتھ اڑا نہ لے جا سکا۔ ڈانٹے اور گوئٹے کی ہڈیاں بھی خاک ہوگئیں مگر "ڈیوائن کامیڈی" اور "فاوسٹ" چمنستانِ ادب میں رہتی دنیا تک اپنی بہار دکھاتے رہیں گے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان مصنفوں کی مذکورہ تصانیف کے غیر فانی ہونے کا سبب کیا ہے؟ اس کا سبب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ ان تصانیف میں ایسی چیز موجود ہے جو ہر زمانے میں ہر ملک کے باشندے کے اعلیٰ و لطیف جذبات کو اپیل کرتی ہے۔ بنابریں اردو کے بالعموم ہر ادیب اور بالخصوص ہر ایسے ادیب کا جو تخلیقی ادب پیدا کرتا ہے یہ فرض ہے کہ اس کا زاویۂ نگاہ مقامی تعصبات سے بالاتر ہو اور وہ جو کچھ لکھتا ہے کم از کم یہ سمجھ کر لکھے کہ اس کی تحریر کے پڑھنے والوں میں ساری دنیا کے پڑھنے والے شامل ہیں۔

("خورشید" جموں ۲۰ مئی سنہ ۳۶ء)

نوجوان اربابِ قلم سے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

ہماری پرانی تہذیب کی یہ خصوصیت تھی کہ خواہ کسی بھی علم و فن کا کوئی آدمی کیوں نہ ہو اس کے ذہن میں مشکل ہی سے کبھی اپنی تعریف آپ کرنے کا خیال پیدا ہوتا تھا۔ لیکن اس زمانے میں اپنی تعریف آپ کرنے کو ایک طرح کا ہنر سمجھا جاتا ہے۔ اور خاص طور پر ہماری زبان یعنی اردو کے اکثر نوخیز اہلِ قلم عام طور پر اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ جو اپنے آپ کو ہندوستان کا مشہور ادیب لکھ کر یا لکھوا کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ ہندوستان صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک براعظم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی آبادی اب غالباً چالیس کروڑ تک پہونچ چکی ہوگی۔ تلیگو، تامل، ملیالم اور بنگالی وغیرہ بہت سی زبانیں اس دیس میں بولی جاتی ہیں۔ ان تمام زبانوں کا بھی اپنا علیحدہ علیحدہ ادب ہے۔ علاوہ بریں ہر زبان کے ادب کے الگ الگ بہت سے شعبے ہیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ان نوجوان دوستوں کو اپنے آپ کو "آل انڈیا" ادیب یا شاعر لکھنے یا لکھوانے کی کیسے

ہمت پڑتی ہے؟ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اس سے ان کا مفہوم اردو کا آل انڈیا ادیب یا شاعر ہے تو اسے بھی درست نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب کوئی شخص فی الواقع آل انڈیا ادیب یا شاعر ہوگا تو بغیر اس کے لکھے ہوئے خود ساری اردو دنیا اسے اردو کا آل انڈیا ادیب یا شاعر لکھنے لگے گی۔ ہمارے نوجوان لکھنے والوں کو ایک اور شوق ہے اور وہ اپنی تصویر چھپوانے کا۔ اکثر نوجوان مضمون نگار، ایڈیٹروں کے پاس اپنی تصویریں لے کر پہونچ جاتے ہیں۔ یا انھیں بھیج دیتے ہیں تاکہ ان تصویروں کو اخبار یا رسالہ میں چھاپ دیا جائے، شاید ہمارے ان دوستوں کو یہ معلوم نہیں کہ پڑھنے والوں کو عموماً مضمون نگاروں کی خوبصورتی یا بدصورتی سے کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔ پڑھنے والے ان کے مضمونوں کے اندر ان کا معنوی جلوہ دیکھنا چاہتے ہیں! مولوی عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو ہند کو تصویروں کا بہت اچھا ذوق ہے جب وہ اورنگ آباد میں رہتے تھے تو ان کے ڈرائنگ روم میں بہت سی اچھی اچھی تصویریں لٹکی رہتی تھیں اتفاق سے ان میں تقریباً چالیس سال پیشتر کا ایک گروپ فوٹو بھی تھا۔ یہ فوٹو آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ بمبئی کے موقعہ پر لیا گیا تھا۔ اس گروپ میں مولانا حالی اور اس دور کے بڑے بڑے نامور اکابر شامل تھے۔ ایک روز میں نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے؟ مولوی صاحب نے فرمایا ہاں شریک ہوا تھا۔ میں نے پوچھا، پھر اس گروپ میں آپ کی تصویر کیوں نہیں ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مجھے مولانا حالی کے ساتھ تصویر اترواتی

ہوئے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ شاید چھ سات سال پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں ڈاکٹر سر محمد اقبال مرحوم اپنے برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک میز پر ان کی چار پانچ چھوٹی چھوٹی تصویریں پڑی ہوئی تھیں۔ غالباً اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب افغانستان یا کہیں اور جانے کے لئے پاسپورٹ بنوانا چاہتے تھے۔ بعض اور لوگ بھی تشریف فرما تھے۔ اتفاق سے ایک ایڈیٹر صاحب بھی تشریف لے آئے۔ وہ اپنے رسالے کا کوئی خاص نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی لجاجت سے ڈاکٹر صاحب سے تصویر مانگی۔ حاضرین میں سے ایک دو صاحبوں نے ایڈیٹر صاحب کی ہمنوائی کی مگر ڈاکٹر صاحب نے تصویر دینے سے انکار کر دیا۔ آخر کار ایڈیٹر صاحب مایوس ہو کر تشریف لے گئے۔ حاضرین میں ایک سیاح بھی تھے۔ انھوں نے اڈیٹر صاحب کے جانے کے بعد ڈاکٹر صاحب سے تصویر طلب کی، مسکراتے ہوئے آپ نے تصویروں میں سے فوراً ایک تصویر اٹھا کر سیاح کے حوالے کر دی۔ ایک صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا کہ آپ نے جیسے ان کو تصویر عنایت فرمائی اسی طرح اس بے چارے ایڈیٹر کو بھی ایک تصویر عطا فرما دی ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہنستے ہوئے ارشاد فرمایا کہ حضرت جس شخص کو مجھے دیکھنا ہوگا۔ وہ میرے شعروں میں میری تصویر دیکھے گا۔ اس فوٹو کو دیکھ کر کیا کرے گا؟ بہر حال اس سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمارے نوجوان اہلِ قلم تصویریں چھپوانا ہی چھوڑ دیں۔ بیشک وہ تصویریں چھپوائیں اور بڑے شوق سے چھپوائیں، لیکن خدا کے لئے اپنی تصویر لے کر ایڈیٹروں تک

کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دیں ؎

حسینانِ جہاں کھنچ کھنچ کے آ جائیں تری جانب
نگاہِ شوق میں وہ سُرمۂ تسخیر پیدا کر

فلسفہ کے شہرۂ آفاق عالم ہربرٹ اسپنسر کے متعلق مشہور ہے کہ اس سے کسی نے سوال کیا کہ آپ کتنا علم جانتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ علم ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے اور میری مثال اس بچے کی سی ہے جو ساحل پر بیٹھا اس سمندر میں کنکریاں پھینک رہا ہے، میرا روئے سخن اپنے اُن نوجوان دوستوں کی طرف ہے جن میں ادب کا جوہر موجود ہے اور جو ادب کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں، میں ان لوگوں سے مخاطب نہیں ہونا چاہتا۔ جن کا مقصد ادب کے پردے میں خالص تجارت ہے۔ سیکھتا وہی ہے جو اپنے آپ کو طالب علم سمجھتا ہے۔ جس نے اپنے آپ کو کامل سمجھ لیا سمجھ لو کہ اسی وقت سے اس کی ترقی کی جڑ کٹ گئی۔

(مقصود بمبئی ۱۹؍ مئی سنہ ۱۹۴۰ء)

مکتوبِ شاد

کتنے تعجب کا مقام ہے کہ شاد عظیم آبادی جیسے یگانۂ روزگار استاد کو جس نے گیسوئے اردو کے سنوارنے میں اپنی عمرِ عزیز کے ساٹھ ستر برس گذار دیئے دنیائے ادب نے اس قدر جلد فراموش کر دیا۔ سنا تھا کہ اہلِ کمال کی مرنے کے بعد قدر ہوتی ہے لیکن شاد کے معاملہ میں یہ کلیہ غلط ثابت ہو رہا ہے نہ تو زندگی میں ان کی کوئی قدر ہوئی اور نہ اب مرنے کے بعد ہی ایسی کوئی سبیل نظر آتی ہے۔ شاد نے بیسیوں کتابیں نثر میں لکھ ڈالیں اور ایک لاکھ سے زیادہ اردو فارسی و عربی شعر کہہ ڈالے۔ انھوں نے جس علم و فن پر قلم اٹھایا استادانہ رنگ میں ایسا لکھ گئے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے۔ اگر ایک طرف انیسویں صدی کے آخر میں ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃ العروس" کے جواب میں "مراۃ الخیال" لکھ کر گورنمنٹ سے انعام حاصل کیا تو دوسری طرف پلاٹ۔ کیرکٹر۔ زبان و اندازِ بیان کے اعتبار سے بعض ایسے ناول لکھے کہ رتن ناتھ سرشار، و شرر جیسے نکتہ سنجانِ ادب کے منہ سے بے ساختہ تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہو گئے۔ جب تاریخ پر قلم اٹھایا تو یہ معلوم ہوا کہ شاد شاعر نہیں بلکہ مورخ ہیں۔ چنانچہ ان کی "تاریخ بہار" آج تک اہلِ نظر کے لئے سرمۂ بصیرت کا کام کر رہی ہے۔ اسی طرح "نوائے وطن" لکھ کر اپنے صوبہ کے شعرا کا حق ماتم ادا کیا۔ اور اپنے استاد کی سوانح عمری موسومہ بہ "حیاتِ فریاد" لکھ کر اپنی

سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ ان کی نثر کی بعض کتابیں چھپ چکی ہیں۔ مگر ابھی کئی ایسی کتابیں باقی ہیں جو دنیا کے سامنے نہیں آئیں۔

شاد نے جب اردو شعر کی طرف توجہ کی تو امیر و داغ اور حالی و شبلی سب نے یک زبان ہو کر ان کے شاعرانہ کمالات کا اعتراف کیا جب فارسی شاعری کی طرف جھکے تو وہ رنگا رنگ گلہائے معانی کھلائے کہ جن کی خوشبو سے حضرت قبلہ علامہ جلال الدین موید الاسلام کا دماغ بھی معطر ہو گیا۔ چنانچہ موصوف نے بارہا اپنے شہرۂ آفاق اخبار "حبل المتین" میں شاد کی تعریف کر کے سخن فہمی کا حق ادا کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ موید الاسلام زمانۂ حال کے ہندوستانی فارسی گو شعرا میں شاد کے سوا کسی کے قائل نہ تھے۔

شاد جب فارسی شعر کہتے تو دوسرے ہندوستانی فارسی گو شعرا کے بخلاف ان کے ہاں علوِ خیال کے علاوہ الفاظ کی تراش خراش۔ محاوروں کی بندش۔ جملوں کی ترکیب اور اندازِ بیان سب کچھ جدید فارسی کے عین مطابق ہوتا تھا۔ شاید یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر ایرانی ادبا شاد کی فارسی دانی کے قائل اور ان کی فارسی شاعری کے شیدا تھے۔

اس دور میں جب کہ ہر شخص دو چار الجھی ہوئی نظمیں اور غزلیں کہنے کے بعد اپنے آپ کو استادِ وقت سمجھتا اور سمجھاتا ہے اور ہر کس و ناکس اخبار یا رسالہ نکال کر جو جی میں آئے لکھے چلا جاتا ہے یہ امید ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ عام ادبی دنیا شاد کے حقیقی کمالات کی طرف توجہ کرے گی۔ لیکن میں یہ بے موقع

ساز اس قول کو پیشِ نگاہ رکھ کر چھیڑ رہا ہوں کہ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اس تحریر کا مقصد نہ تو شادؔ کے شاعرانہ کمالات کی طرف اشارہ کرنا ہے اور نہ مقصود یہ ہے کہ شادؔ کی علمی حیثیت کو نمایاں کیا جائے، یہاں مقصد صرف شادؔ کا ایک خط پیش کرنا ہے۔ انھوں نے یہ خط سر عبدالرحیم کو لکھا تھا اس سے کم سے کم یہ اندازہ ہو سکے گا کہ زمانہ نے شادؔ کی زندگی میں ان کی کتنی "قدر" کی اور اس ملک میں اہلِ علم کی کیا قدر و قیمت ہے؟

پٹنہ سٹی محلہ حاجی گنج
۲۲ر اپریل ۱۹۲۶ء

سرورِ مکرم و محترم من! تسلیم بصد نیاز و تکریم قبول ہو۔
چند ہفتہ ہوئے کہ کتاب نقشِ پائدار حصہ اول تاریخ بہار جو حقیر کے قلم سے لکھی گئی ہے اور بڑے شوق سے ہماری بھتیجی صاحبہ (یعنی جناب کی اہلیہ محترمہ) نے ازراہِ علم دوستی و قدر دانی دو جلدیں خرید کیں نظرِ مبارک سے گزری ہوگی۔

اب تک ہمارے شہر کے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ کتابوں کی خریداری سے کراہت کرتے ہیں اور بلا قیمت غریب مصنف سے کسی طرح حاصل کر کے دست بدست پھراتے ہیں تاکہ دوسروں کو خریداری کی ضرورت نہ رہے شاید کلکتہ کے مسلمان اس حرکت سے بری ہوں اور شاید جناب

کی توجہ سے وہاں کچھ خریدار نکل آئیں۔ میرے ایک دوست جو علم کے شایق اور تصنیفوں کے دلدادہ ہیں مولوی سید معین الدین صاحب قیس[1] تخلص انھوں نے بالفعل ایک کتاب گلشنِ حیات[2] نام لکھ کر چھپوائی ہے (جس میں کچھ حالات حقیر کے بطور سوانح عمری لکھے ہیں) گورنمنٹ نے بھی ایک سو بیس کتابیں خرید کر لی ہیں قیمت فی جلد عہ ہے بطور نذر کے میرے ذریعہ سے جناب کی خدمت میں بھیجنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

غالباً عزیز از جان مولوی ڈاکٹر غلام امام صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ جناب ہی کے پاس بالفعل مہمان ہیں میری طرف سے ان کی خدمت میں سلام و دعا پہونچا دیجیے اور اپنے گھر میں مخلصانہ دلی دعائیں فرما دیجیے۔ زیادہ نیاز کر عرض ہے کہ اب میری آنکھیں اس قابل نہیں رہیں کہ خط و کتابت کر سکوں صرف ٹٹول کر لکھتا ہوں غلطیوں کو معاف فرمایا جائے۔

خاکسار یکے از دعا گویان جناب:۔

سید علی محمد شاد

---

[1] قیس مرحوم حضرت شاد کے ایک ہونہار شاگرد تھے۔ افسوس کہ عین جوانی میں انکا انتقال ہو گیا۔

[2] گلشنِ حیات۔ قیس مرحوم کے بھائی منشی فہیم الدین احمد منیجر رسالہ آئینہ نمبر ہرن باڑی لین کلکتہ سے قیمتاً دستیاب ہو سکتی ہے۔

("فردوس" لاہور دسمبر ۱۹۳۲ء)

سرت بابو

ظاہر ہے کہ ہند میں مستقل طور پر انگریزوں کا اثر و اقتدار پہلے پہل بنگال ہی میں قائم ہوا، پلاسی کے زبردست معرکۂ کارزار نے ہمیشہ کے لئے انگریزوں کو بنگال کے سرسبز و شاداب میدانوں کا مالک بنا دیا۔ جس طرح بنگال میں پہلے پہل صحیح معنوں میں انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی اسی طرح بنگلہ زبان پر انگریزی زبان کا اثر بھی ہندوستان کی دوسری زبانوں کی بہ نسبت سب سے پہلے پڑا اور اہل بنگال نے انگریزی ادب کا اثر قبول کرنے میں اپنے باقی ماندہ ہندوستانی بھائیوں سے کہیں زیادہ پھرتی اور چستی سے کام لیا۔

بنگالیوں کی صرف زبان ہی پر انگریزی کا اثر نہیں پڑا بلکہ ان کے نام بھی بہت کچھ انگریزی زبان کے اثر سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ "مکھوپادھیائے" کی جگہ مکرجی "بندھوپادھیائے" کے بدلے بنرجی یا "باسو" کے بجائے بوس "ٹھاکر" کے بجائے ٹیگور وغیرہ ناموں کی بنیاد پڑ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع ہی سے بنگلہ زبان حکمراں قوم کی زبان کے اثر کو دوسری ہمسایہ زبانوں کی بہ نسبت جلد از جلد قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

مسلمانوں کے عہد حکومت میں سرکاری زبان فارسی تھی۔ بنگلہ پر فارسی کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ آج تک بہت سے ایسے الفاظ اپنی اصل

حالت پر بنگلہ میں موجود اور انہی معنوں میں مستعمل ہیں۔ علاوہ بریں فارسی کے بہت سے ایسے الفاظ بھی بنگلہ میں موجود ہیں جن کی شکل و شباہت مرور ایام سے کچھ بدل گئی ہے۔ لیکن بالحاظ معنی مشترک ہیں۔

ہماری قومی زبان اردو میں ڈاکٹر ٹیگور کے مختصر افسانے بعض ناولوں اور ڈراموں کے علاوہ ان کی نظموں کا ایک بڑا حصہ منتقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح بابو بنکم چندر چیٹرجی اور چند دوسرے بنگلہ مصنفین کی تصانیف اردو میں خال خال نظر آتی ہیں۔ لیکن ان میں سے شاید چوتھائی سے زائد حصہ انگریزی یا ہندی کے ترجموں کو سامنے رکھ کر کیا گیا ہے۔ بہر کیف مجھے ان چند سطروں میں اس مسئلہ پر کچھ عرض نہیں کرنا ہے۔ بلکہ آج کی صحبت میں میں ہندوستان کے بہترین ناول نگار بابو سرت چندر چیٹرجی کے متعلق کچھ عرض کرونگا۔

سرت بابو ۱۵ر ستمبر ۱۸۷۶ء کو ہگلی ضلع کے دیونند اپور نامی ایک چھوٹے سے دیہات میں پیدا ہوئے ان کے دادا بڑے امیر آدمی تھے۔ مگر کچھ دنوں بعد ان کی ساری دولت جاتی رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرت بابو کے باپ کی زندگی نہایت تنگدستی اور افلاس میں بسر ہوئی۔ خود سرت چندر کا بچپن اور اوائل شباب فقر و فاقہ میں بسر ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ اوائل عمری میں وہ خاطر خواہ تعلیم حاصل نہ کرسکے اگرچہ ترکۂ پدری سے سرت بابو کے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ لیکن یہ ضرور ہوا کہ باپ کی بلند حوصلگی اور علم ادب کا شوق انھیں بھی وراثت میں ملا۔ سرت بابو نے اوائل عمری میں ہندوستان کے مختلف گوشوں کی خوب سیاحت کی، سترہ برس کی عمر میں آپ نے مختصر افسانے

لکھنے شروع کئے۔ لیکن گردش ایام کا برا ہو کہ انھیں یہ شغلہ مصائب و افکار کی وجہ سے چھوڑنا پڑا۔ اس طرح اٹھارہ برس تک سرت بابو زمانہ کا سرد و گرم دیکھتے اور مصائب و آلام برداشت کرتے رہے۔ مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔ چنانچہ پبلک کے سامنے ان کے پہلی مرتبہ آنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اس زمانہ میں ان کے بعض پرانے دوستوں نے ایک رسالہ نکالا۔ مگر بنگال کے مشہور انشا پردازوں میں سے کسی نے رسالے کی سرپرستی کرنا منظور نہ کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ رسالہ بہت چھوٹا اور غیر معروف تھا رسالہ نکالنے والوں کو اس موقع پر سرت بابو یاد آئے۔ انھیں وہ زمانہ یاد تھا جب اوائل شباب میں سرت چندر مختصر افسانے لکھا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے سرت بابو سے وعدہ لے لیا۔ ان کا یہ وعدہ نام کا وعدہ تھا ورنہ سچ مچ میں وہ ٹالنا چاہتے تھے۔ جب وہ رنگون واپس پہنچے تو انھیں اپنے وعدہ کا خیال بھی نہ رہا مگر "یاران طریقت" ان کا پیچھا کیوں چھوڑنے چلے تھے۔ انھوں نے خطوں اور تاروں کا تانتا باندھ دیا اب یہ مجبور ہوئے اور از سر نو قلم دوات کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ انھوں نے ایک مختصر افسانہ شائع ہونے کے لیے لکھ بھیجا اور یہی افسانہ ان کی شہرت کا بنیادی پتھر تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ اس مبارک مشغلہ میں لگے ہوئے تھے اور شاید اس عہد میں بنگال کا کوئی ایسا گھر نہیں جہاں سرت چندر کے افسانے عزت و وقعت کی نگاہوں سے نہ دیکھے جاتے ہوں۔

جس طرح ہر ملک و قوم میں نئے مصنف کو مشکلات کا مقابلہ کرنا

اور "نقادوں" کے جور و ستم سہنے پڑتے ہیں اسی طرح سرت بابو پر بھی پہلے پہل بڑی بے دردی ہوئی۔ ان کے ایک ناول "چرترہین" کا ایک حصہ "جمنا" نامی ایک رسالہ میں شائع ہوا۔ اس میں بورڈنگ میں رہنے والے ایک لڑکے اور ایک خادمہ کی داستانِ عشق کا نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس پر ادبی حلقوں میں ایک کہرام مچ گیا اور بہت سے نام نہاد نقادوں نے بابو صاحب کو جی بھر کے گالیاں سنا ڈالیں۔ مگر جب یہ کتاب پوری چھپ کر بنگلہ نقادوں کے سامنے آئی تو بڑے بڑے انشا پردازوں نے اس کی تعریفیں کیں اور اسے بنگلہ ادب میں بڑا عروج حاصل ہوا۔

اس کے بعد ایک زمانہ وہ آیا کہ سرت بابو کی تصانیف پر تنقید و تبصرہ کرنے کے لئے مختلف مقامات پر انجمنوں کی بنیادیں پڑیں۔ انہیں بہتیرے انعام دیئے گئے اور ہر طریقے سے ان کی ہمت افزائی کی گئی۔ سر آشوتوش آنجہانی نے ازراہِ قدردانی سرت بابو کو "جگت رانی میڈل" اپنے دستِ خاص سے عطا کیا۔ یہ تمغہ ہر دو برس کے بعد بنگلہ کے بہترین ادیب کو عطا کیا جاتا ہے۔ سرت بابو کے ناول اس عہد کے بنگلہ ادب میں بہترین خیال کئے جاتے ہیں اور اُن کے مختصر افسانے اپنی خصوصیت کے لحاظ سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ سرت بابو کا ایک ناول "بڑی دیدی" پہلے پہل "بھارتی" میں چھپتا رہا۔ اس ناول پر بہت سے لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ اس کے مصنف "روین بابو" (ڈاکٹر ٹیگور) ہیں اور وہ اسے ایک

فرضی نام سے لکھ رہے ہیں۔ اس کے بہت دنوں بعد ان کا مشہور افسانہ ”امیر تمنی“، نظر آیا۔ اس افسانہ نے ان کی شہرت میں چار چاند لگا دیئے۔

ذاتی طور پر بابو صاحب نہایت خوش اخلاق، با وضع، بلند ہمت اور محب وطن انسان تھے۔ غربا، مساکین اور وہ شخصیتیں جو سوسائٹی کی نگاہوں میں ذلیل سمجھی جاتی ہیں ان کے لئے بابو صاحب کے دل میں بہت بڑی جگہ تھی اور وہ اپنی تصانیف کے ذریعہ سے ان لوگوں کی نمائندگی کے فرائض بدرجہ اتم انجام دیتے تھے۔ ان کے ناولوں میں ”چرترہین“ ”بڑی دیدی“ شری کانت، پنڈت جی، چھوٹی دیدی، منجھ دیدی وغیرہ خاص شہرت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے ناول اور مختصر افسانے بنگال میں بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ بابو صاحب کے ہاں سیرت نگاری کے ساتھ چھوٹے طبقے والوں کی زندگی کے مختلف شعبوں کے حالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انکی تصانیف دیکھنے سے بنگال کی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ دیہاتی زندگی کا چربہ کھینچنے میں ان کا قلم منشی پریم چند سے چشمک زنی کرتا ہے۔ ان کے بعض ناولوں مثلاً ”دیو داس“ اور ”بڑی دیدی“ وغیرہ کے فلم بھی بنائے جا چکے ہیں۔

(ریاست دہلی سنہ ۳۶ء)

چراغ

میرے پیارے چراغ! میری آنکھوں کے تارے چراغ۔ اندھیری راتوں میں اجالا کرنے والے چراغ۔ تیری دھیمی دھیمی روشنی میرے غم زدہ دل کو راحت پہنچاتی ہے۔ برسات کی کالی راتوں میں جب موسلادھار پانی برستا ہے۔ بجلی چمکتی ہے۔ بادل گرجتا ہے۔ ہوا کے تیز جھونکے تیرا چراغ گل کر دینا چاہتے ہیں۔ پروانے تیری آتشِ محبت سے جل کر نیم جان ہو جاتے ہیں۔ ہاں اس وقت میرے طوفان خیز جذبات کا صرف تو ہی نقطۂ خیال رہتا ہے۔

آہ ـــــــ تیری یہ دلدوز ادائیں میرے محشرستانِ تخیل میں ہیجان پیدا کر رہی ہیں۔ کسی کی یاد میں تیرا اٹھکھیلیاں کرتے ہوئے چلنا میرے چمنستانِ جذبات کو خزاں آشنا کر رہا ہے۔

اے چراغ ـــــــ تیرے پاک و بے لوث تبسم میں غم کے آنسوؤں کی جھلک نظر آتی ہے۔

اے چراغ! اے مظہرِ تسلیم و رضا مجھے بھی بندۂ تسلیم و رضا بنا! تو بھی فانی میں بھی فانی۔ جس کا تجھ میں جلوہ ہے۔ وہی مجھ میں ہویدا ہے۔ جس کی تجھ میں نمو ہے اسی کی مجھ میں بو ہے۔ آ قریب تر آ۔ دوئی کو مٹا۔ وحدت کا تماشا دکھا۔ مجھ میں سما جا کہ "میں اور تو" ایک ہو جائیں۔

(رسالہ نیرنگ خیال لاہور ۱۹۲۶ء)

قیمتِ حُسن

سچ ہے " مشرق مشرق ہے ۔ اور مغرب مغرب " جس طرح ان دو اقلیموں کا ایک حیزِ مکانی میں اجتماع محال ہے۔ ٹھیک اسی طرح ان دونوں ملکوں کے باشندوں کا بھی واحد نقطۂ خیال پر جمع ہونا ناممکن ہے۔

" حسن " مشرقی اربابِ نظر کے نزدیک " جمالِ مطلق " کا ایک ایسا بے بہا عطیہ ہے۔ جس کی قیمت کا اندازہ بھی انسانی تصور کے امکان سے باہر ہے۔ خواجہ حافظؔ اپنے شیرازی معشوق کے خالِ ہندو پر سمرقند اور بخارا قربان کرنے کو تیار نظر آتے ہیں۔

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

ایک دوسرے صاحبِ ذوق بزرگ دونوں جہاں کو اپنے معشوق کے جمال کی قیمت کے مقابلہ میں کم ارزش بتاتے ہیں ؎

قیمتِ خود را دو عالم گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

غرض مشرقی نقطۂ نظر سے حسن ایک انمول موتی ہے۔ جس کی قیمت کا اندازہ لگانا بھی خام خیالی ہے۔

اب ذرا یورپ اور امریکہ میں حُسن جیسی انمول شے کی ناقدری ملاحظہ

ہو۔ امریکہ جسے حسن فروشوں کی دنیا کہنا چاہئے۔ حسینوں کے مول تول میں یورپ سے بھی دو قدم آگے ہے۔ وہاں صرف حسینوں یا بالفاظِ دیگر حسن کی قیمت ہی مقرر نہیں ہے۔ بلکہ اس کے مدارج تک معین ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ہر درجہ کی قیمت بھی مختلف ہوا کرتی ہے۔ پھر لطف یہ کہ حسن کی یہ طبقہ بندی صرف نظری حیثیت ہی سے تسلیم نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ قانونی جامہ زیب تن کر کے عملی حیثیت سے رواج پا گئی ہے۔

امریکہ میں عام طور پر "حُسن" چار درجوں پر تقسیم کیا گیا ہے:-

۱۔ فلم ایکٹرس کا حسن

۲۔ تھیٹر ایکٹرس کا حسن

۳۔ بال (رقص خانہ) میں ناچنے والی عورتوں کا حسن

۴۔ عام دلربا حسن

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طبقہ بندی محض خیالی نہیں۔ بلکہ رائج الوقت قانون کا جامہ پہن کر عملی حیثیت سے مسلّم ہے۔ مثلاً اگر کسی شامت زدہ حجام کی غفلت سے کسی پیکرِ حسن کے رخسارِ زیبا کو چیر کا لگ جائے۔ تو عدالت مرتکب کو جرمانہ کی سزا دے گی۔ جو مندرجہ بالا طبقہ بندی کا لحاظ رکھتے ہوئے مختلف ہو گی۔ اگر سینما کی ایکٹریس کے رخسارِ نازنیں مجروح ہونے پر پانچ ہزار ڈالر جرمانہ ہو گا۔ تو تھیٹر کی ایکٹریس کے رخسارِ زیبا کی قیمت (جرمانہ) تین ہزار قرار پائے گی۔ اسی اعتبار سے باقی دو درجوں کے لئے یکے بعد دیگرے قیمت کم ہوتی جائے گی۔

قیمت حسن کی تعیین کا نظریہ منطقی دلائل سے ثابت کیا جاتا ہے چنانچہ ان لوگوں کا بیان ہے کہ جس طرح کانچ کے برتن میں بال پڑ جانے سے اگرچہ وہ قابل استعمال رہتا ہے۔ لیکن اس کی اصلی قیمت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح اگر کسی حسین عورت کے رخسار نازنین کو چرکا لگ جائے۔ تو گو اس کی شخصیت باقی رہتی ہے۔ لیکن حسن میں کمی آ جاتی ہے بنا بریں جس بیداد گر کا فعل جنس حسن کی شکست قیمت کا باعث ہو۔ اس سے جرمانہ وصول کرکے صاحب حسن کو دے دینا چاہئے۔ تاکہ تلافی مافات ہو جائے۔

اس سلسلہ میں ذیل کے چند دلچسپ واقعات پڑھنے کے لائق ہیں۔

مشہور فلم ایکٹرس مس جونٹیا جانسن ایک روز حمام میں غسل کے لئے گئی۔ حمام کے ملازم نے غلطی سے ٹھنڈے پانی کے حوض میں گرم پانی ڈال دیا۔ جس کی گرمی ۵۰ درجۂ حرارت تک پہنچی ہوئی تھی۔ پانی سر پر انڈیلتے ہی چہرہ خال پوش اور تمام جسم آبلہ دار ہو گیا۔ موصوفہ اسی وقت بے ہوش ہو گئی۔ حمام والوں نے ہسپتال پہنچا دیا۔ جہاں اسے دو ہفتہ تک زیر علاج رہنا پڑا۔ صحت یابی کے بعد اس نے عدالت میں حمامی کی غفلت کے خلاف چارہ جوئی کی۔ عدالت نے ثبوت پاکر حمام والے کو ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا دی۔ جرمانہ کی پوری رقم مس موصوفہ کو دے دی گئی۔ کیونکہ اس کا چہرۂ زیبا خال پوش ہو کر اپنا اصلی رنگ و روغن کھو چکا تھا۔

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اسی طرح ایک روز مسز بسیلین جیمز نامی فلم ایکٹرس ایک کروڑپتی

چاہنے والے کی زینتِ آغوش بن کر موٹر پہ ہوا خوری کو نکلی۔ سوءِ اتفاق۔ کہیے یا عاشق کی بدبختی کہ موٹر کار درخت سے ٹکرا گئی اور سامنے کا شیشہ ٹوٹ کر مسز موصوفہ کی چاند سی پیشانی پر آ گیا۔ جبینِ ناز کا زخم تو کچھ دنوں میں اچھا ہو گیا۔ مگر کم بخت داغ باقی رہ گیا۔ آپ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے عاشق پر دعوے دائر کر دیا۔ عدالت نے بھی پانچ لاکھ ڈالر کی ڈگری دے دی مگر مسز موصوفہ نے انتہائی رحم دلی سے صرف چار ہزار ڈالر وصول کر کے اپنے عاشق کو معاف کر دیا۔ 6

معشوقی و بے حوصلگی طرف بلا ہے

۱۹۲۰ء میں ایک دوسری مشہور فلم ایکٹریس مس ایلیگن امبرا کا زانو موٹر کار کے ایک حادثہ سے زخمی ہو گیا تھا۔ عدالت نے مجرم سے چار ہزار ڈالر مسز موصوفہ کو دلوا دیئے۔ مجرم نے اس فیصلہ کے خلاف عدالتِ عالیہ میں اپیل دائر کر دی۔ عدالت عالیہ نے مجرم کے وکیل کی اس دلیل پر کہ زانو کپڑے سے ڈھکا رہتا ہے۔ رقم جرمانہ میں تین ہزار ڈالر کی کمی کر دی۔ دو سال کے بعد سایہ کی جاروب کشی کا دور ختم اور زانو تک کھلا رہنا فیشن میں داخل ہو گیا۔ مسز موصوفہ نے دوبارہ عدالت میں چارہ جوئی کر کے فیشن کی بدولت تین ہزار ڈالر کی مزید رقم حاصل کر لی ؛

یہ اور اسی طرح کے بہت سے واقعات آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہاں تک شمار کرے۔ حسن جوانی آنکھ۔ ناک۔ کان۔ ہونٹ۔ گال، غرضکہ جسم اور جسم کے تمام اعضاء کا بیمہ ایک عام بات ہو

حال ہی میں پیرس کی ایک مشہور ایکٹریس کے بائیں گال پر چند دانے نکل آئے تھے۔ اس نے دوسری طرف کے گال کا بیمہ کرایا۔ بیمہ کی رقم سن کر ناظرین ضرور تعجب کریں گے۔ ایک ملین یعنی دس لاکھ فرانک جو ہندوستانی روپے کے حساب سے تقریباً ساڑھے تین لاکھ روپے ہوتے ہیں۔ بیمہ کمپنی کی طرف سے چار ڈاکٹر تعینات کئے گئے۔ جن کا کام صرف موصوفہ کے گال کی دیکھ بھال تھا: تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ گال پر چند پھنسیاں نکل آئیں اور بیمہ کمپنی کو اتنی بھاری رقم ادا کرنی پڑے۔ غرض یورپ اور امریکہ میں دنیا کی دوسری تمام چیزوں کی طرح حسن کا بھی مول تول مقرر ہے اور یہی وہ نقطۂ امتیاز ہے۔ جس سے

"مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب"

(رسالہ فانوس لاہور نومبر ۳۲ء)

رسالۂ عالمگیر کا روسی ادب نمبر

ظاہر ہے کہ آج کل ہماری زبان ترجمے کے دور سے گذر رہی ہے اس وقت اردو میں جو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے اس کا بڑا حصہ ترجموں پر مشتمل ہے۔ اچھے ترجمے بھی شائع ہوتے ہیں اور برے بھی۔ یہ وقت دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان پر آ چکا ہے اور اس منزل کو طے کرنے کے بعد ہی کوئی

کوئی زبان اس وادی میں داخل ہوتی ہے۔ جب ایک خیال کے اظہار کے لئے زبان میں دس دس اور بیس بیس اسلوب پیدا ہو جاتے ہیں۔

اس وقت جو اصحاب ترجموں کے ذریعہ سے اردو کو مالا مال کرنے میں مصروف ہیں۔ ان میں میرے نوجوان اور ہونہار دوست مسٹر سعادت حسن منٹو کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ موصوف نے صرف ایک ملک (روس) اور اس ملک کی زبان (روس) کے لٹریچر کو اپنا خاص موضوع قرار دیا ہے۔ اگر ہماری زبان کے دو نوجوان ادبا جو ترجموں کے ذریعہ اپنی زبان کے لٹریچر میں اضافہ کرتے رہتے ہیں اسی طرح کسی ایک زبان کے لٹریچر کو اپنا موضوع بنالیں تو بہت جلد ہماری زبان کا خزانہ دنیا کی مختلف زبانوں کے اعلیٰ لٹریچر سے مالا مال ہو جائے۔

روسی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت حقیقت نگاری ہے اور یہ رام رنگی افسانوی ادب کی بوتل میں آکر اور زیادہ تیز ہو گئی ہے۔ پشکن۔ گوگل۔ تورگنیف اور دوستوولسکی سے لے کر گارشن۔ چیخوف۔ ستولوگب گورکی۔ گیبرن۔ اور توبن سب کے افسانوں میں یہی ایک روح کام کر رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا انداز بیان جداگانہ ہے اور ان میں سے ہر ایک زندگی کو ایک دوسری عینک سے دیکھتا ہے۔ لیکن جہاں تک افسانہ نگاری میں حقیقت و واقعیت کا تعلق ہے یہ سب کے سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ آنریبل ماریس بیرنگ نے روسی ادب کے متعلق کیا خوب کہا ہے۔

"اگر ہم دوسرے ممالک کے لٹریچر کو پیش نظر رکھ کر روسی ادب کا سرسری نظر سے مطالعہ کریں تو سب سے پہلی تعجب انگیز چیز جو ہمیں اس میں نظر آئے گی۔ وہ اس کی نہایت ہی مختصر زندگی کے باوجود اس کا شاندار لٹریچر ہے۔ روسی ادب ازمنہ وسطیٰ نشاۃ الثانیہ دی لون، ڈانٹے اور چاسر سے یکسر تہی دامن ہے۔ اس سرزمین نے اسکاٹ پیدا کئے بغیر گننگ کو جنم دیا ہے۔ حالانکہ اس زبان کے ادب کا آغاز انیسویں صدی سے ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ دوسرے ملکوں کے لٹریچر سے روسی ادب عمر میں بہت چھوٹا ہوتے ہوئے بھی روحانی لحاظ سے نہایت عمر رسیدہ ہے تو ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ واقعہ ہے کہ روسی ادب کا پھل نیم رس ہوئے بغیر تمام رس ہو گیا ہے غالباً اس کی عظمت کا راز بھی یہی چیز ہے"

ایک روسی نقاد اپنی زبان کے ادب کے متعلق کہتا ہے:-

"علم کے معاملہ میں بہت کہنہ سال اور اشک ریزی کے معاملہ میں بہت عقلمند ہے"

میں یہاں روسی ادب کے متعلق کسی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا کیونکہ اس کی طرف "تعارف" میں نہایت مختصر انداز میں سعادت حسن صاحب اشارہ کر چکے ہیں۔ علاوہ بریں روسی ادب جدید کے بانی "میکسم گورکی" پر ان کے قلم سے ایک اور مضمون بھی اسی نمبر میں موجود ہے۔ اس نمبر میں پشکن۔ گوگل۔ تورگنیف۔ دوستووسکی۔ گارشن۔

چیخوف۔ سولوگب۔ گورکی۔ کیپرن۔ اینڈریو اور بونن وغیرہ مشہور روسی افسانہ نگاروں کے افسانے نظر آئیں گے۔ البتہ سالیکوف۔ کورونسکو۔ پوتاپینکو اور سمینوف ایسے افسانہ نگار ہیں کہ اگر انھیں نظر انداز نہ کیا جاتا تو اچھا تھا لیکن اس نمبر میں جن روسی افسانہ نگاروں کے افسانے پیش کیے گئے ہیں ان کے مقابلے میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ علاوہ بریں ان لوگوں کے افسانوں کی عدم موجودگی کے باوجود اس نمبر میں جو افسانے دیئے گئے ہیں۔ ان سے روس کے افسانوی ادب کی خصوصیات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ اس نمبر میں "سوویٹ روس" (روس جدید) کا لٹریچر نہیں کے برابر ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ جب تک سوویٹ لٹریچر کے متعلق کم از کم اس ضخامت کا ایک علیحدہ نمبر نہ نکالا جائے۔ اس وقت تک یہ امر عام اردو پڑھنے والوں کی سمجھ میں آنا نہایت مشکل ہے کہ فی الحقیقت سوویٹ لٹریچر سے کیا مراد ہے؟

سوویٹ روس کی زندگی ہندوستان کی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں زندگی کے متعلق لوگوں کا نظریہ ہمارے نظریۂ حیات سے قطعاً جداگانہ ہے! سوویٹ نظام میں "اجتماعی" انسان ایک چیز ہے اور ہمارے ہاں "انفرادی" انسان۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے۔ کہ لٹریچر سوسائٹی کا آئینہ ہوتا ہے لہٰذا اگر اس لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو عالمگیر کے کارکنوں نے اس نمبر میں سوویٹ روس کے ادب کے بہت

کم نمونے پیش کر کے ایک طرح سے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے کیونکہ اگر وہ سوویٹ لٹریچر کے دو چار اور نمونے اس نمبر میں شامل کر دیتے تو اس سے کوئی مفید بات پیدا نہ ہوتی۔

سوویٹ لٹریچر کی اس کمی کی دوسری وجہ رسالہ کی تنگ دامانی ہے۔ ایک مختصر رسالے کے دو ڈھائی سو صفحات نہ تو کسی ملک کے پورے لٹریچر پر احاطہ کر سکتے ہیں۔ اور نہ انھیں پڑھ کر کسی زبان کے لٹریچر کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ کوشش اس لحاظ سے ضرور قابل داد ہے کہ اس نمبر میں جو کچھ ہے، اس کا تعلق محض ایک ملک اور اس ملک کے لٹریچر سے ہے۔

رسالے میں تنوع پیدا کرنے اور دلچسپی قائم رکھنے کے لیے روسی ادب اور روسی زندگی سے تعلق رکھنے والے چند دوسرے مضامین بھی مندرج کیے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایسے اصحاب کے لیے جن کے پاس روسی ادب کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور روسی ادب سے لطف اٹھانے کا اردو کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ یہ نمبر بہت مفید ثابت ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ پبلک اس نمبر کی خاطر خواہ قدر کر کے کارکنانِ رسالہ کی ہمت افزائی فرمائے گی۔

(نوٹ، یہ پیش لفظ رسالہ "عالمگیر" لاہور کے روسی ادب نمبر بابت ۱۹۳۵ء پر لکھا گیا تھا)

چند تبصرے

سالنامہ نیرنگِ خیال

نیرنگِ خیال نے ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی اپنا سالنامہ شائع کیا ہے۔ جو ۲۳۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نمبر میں نظم و نثر دونوں کے مختلف قسم کے نمونے نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر ایک طرف چند نوخیز مضمون نگاروں کی تصاویر ہیں تو دوسری طرف آرٹ کی بعض اچھی تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ جن میں سے مشکل ہی سے بعض اس سے پیشتر کسی اردو رسالے میں شائع ہوئی ہوں گی۔ اس ضمن میں ایک فروگذاشت ہوگئی ہے وہ یہ کہ "حسن و نغمہ" کے نام سے جو تصویر شائع ہوئی ہے اصل میں اس کا عنوان "خواب" ہونا چاہیے۔ نہ معلوم یہ غلطی کیسے ہوگئی اگرچہ رشید احمد صدیقی صاحب کا مضمون ریڈیو کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھا گیا ہے تاہم وہ سنجیدہ ظرافت کا اچھا نمونہ ہے۔ "غالب کے کلام میں صنائع و بدائع" کے عنوان سے ایک اور بہترین ظریفانہ مضمون چھپا ہے۔ جس پر ایک مختصر سے نوٹ میں یہ بتایا گیا ہے کہ "یہ مذاحیہ مضمون لاہور کی ایک ادبی محفل میں پڑھا گیا تو چند لکھنوی حضرات نے بہت داد دی اور کہا کہ یہ عالمانہ تنقید کا بہترین نمونہ ہے"۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نوٹ محض

ازراہِ تفنن درج کیا گیا ہے۔ ورنہ جہاں تک مجھے علم ہے لاہور میں کوئی ایسے لکھنوی بزرگوار موجود نہیں جنھیں شعر و ادب میں کوئی کمال حاصل ہو۔ قطع نظر اس سے مدت ہوئی کہ لکھنؤ سے " صنائع و بدائع کے جاندادہ حضرات رخصت ہو چکے۔ نجانے اس نوٹ کی اشاعت کی کیوں ضرورت محسوس کی گئی؟ حصۂ نثر میں بعض دوسرے اچھے مضامین نظر آتے ہیں۔ حصۂ نظم کو بھی غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے حسبِ ذیل دو شعر مجھے بہت پسند آئے۔

خود سوچتا ہوں میں کہ یہ کیا ہو گیا مجھے ؞ وعدہ نہیں کسی کا مگر انتظار ہے

میں نے مانا تمھیں کچھ مجھ سے سروکار نہ تھا ؞ جاتے جاتے مجھے کیوں تم نے پلٹ کر دیکھا

حکیم یوسف حسن صاحب کو ایک ایسے گلچیں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جو ہر طرح کے پھول جمع کر کے ایک ایسا خوبصورت گلدستہ بناتا ہے جس میں ہر مذاق اور ہر طبیعت کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔ نیرنگ خیال کے ذریعہ حکیم صاحب نے اردو صحافت کی بڑی خدمت کی ہے۔ اور پنجاب کے کئی لکھنے والے تو محض اسی رسالہ کے ذریعہ منظر عام پر آئے ہیں آج کل حکیم صاحب مالی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ بالعموم اردو رسالوں کے شائقین اور خاص طور پر پنجاب کے اردو خواں طبقہ کو چاہیے کہ وہ حکیم صاحب کے رسالے کو خرید کر ان کی ہمت افزائی فرمائے۔

عالمگیر بہار نمبر

پنجاب میں بسنت کی رُت اپنے اندر جو جاذبیت اور کشش رکھتی ہے اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں۔ جنھیں اس موسم میں اس خطے میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس زمانے میں خاص طور پر لاہور تو ایک طرح سے جنتِ ارضی بن جاتا ہے اس موسم میں، اس مینو سواد میں رہتے ہوئے شاید ہی کوئی ایسا کم بخت ہوگا جس نے ساحلِ راوی کی چاندنی راتوں، لارنس کی رنگین شاموں، جہانگیر کے مقبرے کی دوپہر، اور شالامار کے میلے کا لطف نہ اٹھایا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جذبات خیزی کے لحاظ سے ہندوستان میں مشکل ہی سے چند شہر لاہور کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اگر ایسے موسم میں حافظ محمد عالم صاحب کی طبیعت بھی لہرائی اور انھوں نے عالمگیر کا بہار نمبر نکال دیا تو اس پر کسی کو تعجب نہ ہونا چاہیے۔ اس نمبر میں نظم و نثر کے تمام مضامین کا تعلق بہار سے ہے۔ نہ جانے حافظ صاحب نے اس خاص نمبر میں صرف دو ہی تصویروں کی اشاعت پر کیوں اکتفا فرمایا۔ اور زیادہ تصویریں کیوں شائع نہ کیں۔ امید ہے کہ آئندہ بہار نمبر میں اس کی تلافی کر دی جائے گی۔ اردو رسالوں کے قدردانوں کے لیے یہ بہاریہ تحفہ غنیمت ہے۔

شاعرِ آگرہ

یہ ماہنامہ حضرت سیماب اکبر آبادی کی نگرانی اور ان کے صاحبزادے اعجاز صدیقی صاحب کی ادارت میں ایک عرصہ سے نکل رہا ہے۔ اور اپنے دائرہ میں شعر و ادب

کی قابلِ تعریف خدمت انجام دے رہا ہے۔ اس رسالے میں تحقیق و تصحیح کے عنوان سے ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے۔ جس میں مختلف قسم کے ادبی سوالات کئے جاتے ہیں اور ادارے کی طرف سے ان کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ اس باب میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی افادی حیثیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رسالے میں نظم و نثر کے اچھے اچھے مضمون بھی نظر آتے ہیں۔ مسائلِ حاضرہ پر نظم کے پیرایہ میں حضرتِ سیماب کے پیغامات بھی شائع کئے جاتے ہیں۔ میری رائے میں اگر ان پیغامات کو شاعر کے بجائے کسی اخبار میں شائع کیا جائے۔ تو بہتر ہوگا۔ آخر میں سیاسیاتِ حاضرہ پر ایڈیٹر صاحب کی جانب سے کچھ نوٹ بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ان نوٹوں کی اشاعت شاعر میں نامناسب سی معلوم ہوتی ہے۔ ریویو کے معاملہ میں ایڈیٹر صاحب کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ دنیا کا کوئی ایڈیٹر ایک ہی وقت میں دنیا بھر کے لکھنے والوں کو خوش نہیں کر سکتا۔ "شاعر" کے جہاں اور مقاصد بتائے جاتے ہیں، ان میں سے ایک شعر و ادب کی اصلاح بھی بتایا جاتا ہے۔ اس لئے اِس رسالے اور خالص تجارتی رسالوں کے تبصروں میں فرق ہونا چاہیئے امید ہے کہ پبلک اس رسالے کی سرپرستی سے دریغ نہ کریگی۔

سُہاگ لاہور

ہندوستان کی مسلم خواتین زندگی کے ہر شعبہ میں دوسرے ممالک کی خواتین سے بہت

سمجھے ہیں۔ ترکی دنیا کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت ہے۔ وہاں عورتوں کی مستقل فوج تک قائم ہو چکی ہے۔ اور ایسے نیم فوجی کاموں کا تو ذکر ہی نہیں۔ جن میں وہ مردوں کے دوش بدوش حصہ لے رہی ہیں۔ اسی طرح ایران، مصر اور عراق وغیرہ دوسرے اسلامی ممالک میں بھی عورتیں بہت بیدار ہو چکی ہیں اور وہ قومی دولت میں اضافہ کی خاطر اپنے اپنے ملک کی سرگرمیوں میں مردوں کے ساتھ حصہ لے رہی ہیں۔ مگر ہماری ہر بات ساری دنیا سے نرالی ہے ہمارے ہاں عام طور پر عورتوں کو صرف بچے پالنے اور کھانا پکانے کی مشین سے زیادہ وقعت نہیں دی جاتی۔ ہندوستانی مسلمان بہت غریب ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ وہ دیرینہ رواج کی غلط پابندیوں کو توڑ دیں۔ زمانے کی ضرورت کو پہچانیں اور مسلم خواتین کو زندگی کے وہ حقوق عطا کریں جن کی وہ مستحق ہیں۔ تاکہ مسلمانانِ ہند کی "قومی دولت" میں قابلِ قدر اضافہ ہو۔ "سہاگ" میں نظم و نثر دونوں قسم کے مضامین نظر آتے ہیں۔ مضمون نگاروں میں عورتوں اور مردوں دونوں کے نام دکھائی دیتے ہیں۔ اگر یہ رسالہ ہماری خواتین کو دیگر ممالک کی خواتین کی تحریکوں سے واقف کرنے اور گھریلو صنعتوں کی طرف ان کی توجہ منعطف کرانے کی کوشش کرے تو یہ قوم کی بڑی خدمت ہوگی۔ میری رائے میں سہاگ میں ایسے مضامین کی سخت ضرورت ہے جن میں ایک طرف مسلم خواتین کے حقوق و مراعات کے لئے جد و جہد کی جائے اور دوسری طرف عہدِ حاضر کی عمرانی ضرورتوں کے تحت ہماری خواتین کی ذہنی تربیت کا سامان ہو۔

عام وضع کے نثر و نظم کے مضامین جمع کر کے چھاپ دینے سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ "سہاگ" ایک نیا رسالہ ہے اور اس کی اٹھان کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر اسے صحیح خطوط پر چلایا گیا، تو یہ بہت جلد ہندستانی مسلم خواتین کا حقیقی ترجمان بن جائے گا۔ ساتھ ہی ساتھ ادارہ "سہاگ" سے یہ گذارش بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکے رسالے میں مردوں کے بجائے خود عورتوں کے لکھے ہوئے مضامین شائع کیے جائیں۔ امید ہے کہ ہماری محترم خواتین بساطِ صحافت کے اس تازہ وارد مہمان کی خاطرداری میں کوتاہی نہ کریں گی۔

(رسالہ چاند بمبئی۔ مئی سنہ ۱۹۴۰ء)

نادر کاکوروی کی شاعرانہ موت

جس طرح "جدید نظم اردو" کے موجد کی حیثیت سے پروفیسر محمد حسین آزاد کے سر پر اولیت کا تاج رکھا جائے گا۔ اسی طرح منشی نادر علی خاں نادر کاکوروی مرحوم کے نام کے ساتھ نظم اردو کی تاریخ میں لکھا جائے گا کہ میدانِ سخن کے اس شہسوار نے نظم اردو کے تنگ میدان میں ترقی کے نئے نئے گوشے پیدا کیے۔ اردو شاعری میں گیت کی ایجاد کا سہرا نادر کے ہی سر ہے۔ چنانچہ ان کا مشہور گیت "اکثر شبِ تنہائی میں"

آج تک اہلِ ذوق کی زبانوں پر جاری ہے۔ اسی طرح ان کی دوسری زمینیں "شب ماہ" اور "اے ہم صفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے" وغیرہ ابھی تک لوگوں کے حافظے سے محو نہیں ہوئی ہیں۔ افسوس کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے بھری جوانی میں اس نادرہ روزگار شاعر کو ہم سے چھین لیا ورنہ اگر وہ زندہ رہتے تو خدا جانے چمنستانِ شاعری میں کیسے کیسے گل بوٹے کھلاتے۔ نادر کی زندگی میں جذباتِ نادر کے نام سے ان کے کلام کے دو مجموعے چھپ کر مقبول ہو چکے تھے۔ تیسرا مجموعہ تیار ہو رہا تھا کہ موت نے آگھیرا۔ ان کے بعد کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ان جواہر پاروں کو ملک کے سامنے پیش کر دیتا۔ نادر مرحوم کے حقیقی برادر محمد ادریس احمد عباسی صاحب کا بیان ہے کہ ان جناب اور ان کے برادر بزرگ انیس احمد عباسی صاحب مدیر "حقیقت" لکھنؤ نے نادر کی موت کے کئی سال بعد بہت کچھ کوششیں کیں۔ کہ کسی طرح اس مرحوم کا پورا کلام ایک مجموعہ کی صورت میں چھپوا دیں۔ لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ نادر کا غیر مطبوعہ کلام ملنا تو دور رہا۔ جذباتِ نادر کے دونوں مطبوعہ حصے بھی ہاتھ نہ آ سکے۔ آخر مجبور ہو کر ان حضرات کو اس خیال سے ہاتھ اٹھانا پڑا۔ ان اصحاب کے تھک کر بیٹھ رہنے کے بعد راقم الحروف نے کمر ہمت باندھی۔ اور بطور خود کوشش کرنے کے علاوہ ادریس احمد صاحب کے مشورے سے متعدد مقامات پر خطوط لکھے۔ لیکن کہیں سے کوئی امید افزا جواب نہ آیا۔ آخرکار اس خیال سے راقم نے بھی ہاتھ اٹھایا۔ ممکن ہے کہ

کہ مستقبل میں کوئی دوسرا حوصلہ مند و بلند ہمت اُٹھے اور وہ سعادت جس سے ہم لوگ محروم رہے اس سعادت مند کے نصیب میں آئے۔ بہرکیف اس وقت نہ تو نادر کی شاعرانہ خوبیوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، اور نہ مقصد یہ ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی جائے۔ بلکہ یہاں ان کی موت کے متعلق محض ایک واقعہ پیش کرنا ہے۔ ادریس احمد صاحب روایت کرتے ہیں کہ نادر عالمِ نزع میں تھے، عزیز و اقارب آس پاس جمع تھے ہر طرف اداسی اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ نادر کے چھوٹے بھائی بھی موجود تھے۔ انھوں نے ایک صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ رات خواب میں ایک غزل ہوئی تھی۔ غزل تو یاد نہ رہی فقط ایک مصرعہ یاد رہ گیا ہے۔ غزل و مصرعہ کے الفاظ سن کر نادر نے آنکھیں کھول دیں اور بولے بھئی وہ غزل کیا ہے؟ ذرا ہم بھی سنیں۔ نادر کے بھائی نے پڑھا:۔

قفس میں مرغِ بسمل کے تڑپنے میں مزا کیا ہے

نادر نے آخری سنبھالا لیا اور کہا:۔

نکل جانِ حزیں اس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے

اس مصرع کے ساتھ روح کا مرغِ بسمل جسم کا قفسِ خاکی چھوڑ کر پرواز کر گیا اور یہ مطلع صفحۂ روزگار پر ہمیشہ کے لئے یادگار رہ گیا۔

قفس میں مرغِ بسمل کے تڑپنے میں مزا کیا ہے
نکل جانِ حزیں اس جسمِ خاکی میں دھرا کیا ہے

(رسالہ تاج لاہور مئی ۱۹۳۴ء)

مولانا شبلیؒ کی ادبی حیثیت

اس سے پیشتر میں اسی موضوع پر رسالہ "شباب اردو" لاہور میں کچھ لکھ چکا ہوں لیکن ان چند سطور سے بعض حلقوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ الناظر کے مضمون نگار نے ڈپٹی نذیر احمد اور حالی کی اردو کو عامیانہ اور سوقیانہ لکھا ہے۔ ہمارے بھولے بھالے مضمون نگار کو معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا شبلی کی شہرت کا اصل راز ان کے تاریخی لکچر اور مذہبی مواعظ ہیں جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر دیئے گئے۔ مولانا شبلی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ دار العلوم ندوہ ہے۔ وہ اردو کے مصنفین میں اچھی جگہ پر ہیں۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ ادبی مقابلہ میں وہ آزاد۔ نذیر احمد اور حالی سے گوئے سبقت لے جائیں۔ طرفہ تماشہ یہ کہ مضمون نگار نے ہر جگہ مولانا شبلی کو علامہ اور بے چارے نذیر احمد اور آزاد کو ڈپٹی نذیر احمد اور پروفیسر آزاد لکھا ہے۔ جس سے لکھنے والے کے جذبات کا صاف اظہار ہوتا ہے مولانا شبلی دراصل حالی، نذیر احمد اور آزاد کے متبع تھے اور انھیں بزرگوں کا فیضِ صحبت تھا کہ وہ صحیح معنوں میں شبلی ہو گئے۔ ان کا اصلی میدان مذہب اور تاریخ تھا۔ آج کل لوگوں نے یہ قاعدہ بنالیا ہے کہ کسی انشاپرداز کی رائے درج کردی اور جھٹ اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔ اسی طرح الناظر کے مضمون نگار نے شبلی کے متعلق مولوی مہدی حسن مرحوم افادی الاقتصادی کی رائے

جا بجا درج کر دی ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ حالی آزاد اور نذیر احمد کے لئے بھی چند سطریں افاداتِ مہدی سے نقل کر کے اپنی انصاف پسندی کا ثبوت دیتے۔ میں یہاں صرف چند سطریں آزاد کے متعلق نقل کر دوں گا۔ جس سے ناظرین پر واضح ہو جائے گا کہ نذیر احمد۔ حالی، شبلی کی نگاہوں میں آزاد کا کیا رتبہ تھا۔ مولوی مہدی حسن مرحوم کا یہ مضمون ۳۰ر اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کے خطیب میں معارف سے نقل کیا گیا تھا۔ وھو ھذا

ابھی یہ فیصلہ باقی ہے کہ حالی کی روشِ جدید نے آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل اور ان کے نتائجِ فکر سے کہاں تک فائدہ اٹھایا۔ جن کو تاریخی حیثیت سے کم از کم اولیت کا شرف حاصل ہے۔ مختصر یہ کہ متاخرین ادب کے ساتھ سرسید کا درجہ متناسبہ صرف مربیانہ تھا۔ اس لئے ایسی باوقار ہستی سے چشمک تو خیر اس کی کسرات بھی بہ مشکل ہاتھ آئیں گی۔

پروفیسر آزاد اس قدر بلند خیال اور استادانہ دل و دماغ رکھتے تھے کہ ان کے یہاں بھی جہاں تک معاصرین کا تعلق ہے چشمک کا گذر نہیں ایک واقعہ دلچسپ اہلِ ذوق کی ضیافتِ طبع کے لئے لکھتا ہوں۔ لاہور میں جب پہلی دفعہ ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ہوا تو پروفیسر آزاد زندہ تھے۔ گو دماغ کسی حد تک متاثر ہو چکا تھا۔ نذیر احمد ملنے کے لئے گئے حالی اور شبلی بھی ساتھ تھے۔ نذیر احمد کا لکچر ہونے والا تھا۔ جو چھپا ہوا ان کے ہاتھ میں تھا۔ آزاد رسالہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نذیر احمد نے یہ کہہ کر آگے بڑھا دیا کہ ایک نظر دیکھ لیجئے کانفرنس میں پیش کرنا ہے۔ آزاد

قلم سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اور کاٹ چھانٹ شروع کر دی۔ نذیر احمد، آزاد کی بے تکلفی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جوشِ محبت سے آنکھیں پُرنم ہو گئیں ان کو قدرتی طور پر یہ خیال آیا کہ ابھی ان کے دائرہ میں ایک شخص ایسا موجود ہے جو ایک بوڑھے بچے کی مشقِ سخن پر نظرِ ثانی کر سکتا ہے۔ حالی بھی آزاد کی استادی کا لوہا مانتے تھے۔ ان کی مخلصانہ عقیدت کیشی کے لئے وہ تقریظ و تنقید دیکھئے جو آبِ حیات و نیرنگِ خیال پر حالی نے لکھی ہے۔ اور جس میں ضمناً یہ طے کر دیا ہے کہ نیچرل شاعری دراصل آزاد کی صنعتِ فکر کا نقشِ اولیں اور ان کی اولیات میں محسوب ہونے کے لائق ہے۔ حالی لکھتے ہیں کہ نظم و نثر میں بہت کچھ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ یعنی لٹریچر کے طول و عرض کا رقبہ بہت کچھ بڑھ گیا۔ لیکن اس کا ارتفاع جہاں تھا وہیں رہا۔ یعنی اخلاقی سطح بہت اونچی نہیں ہوئی۔ لیکن آزاد کی پاکیزہ خیالی اور خوش بیانی نے یہ کمی پوری کر دی۔ نیرنگِ خیال کی بہت کچھ داد دی ہے۔ کیونکہ آزاد کے قلم نے پہلے پہل جذباتِ انسانی کی تجسیم و تشخیص کی اور معقولات کی تصویریں محسوسات کی شکلوں میں کھینچی ہیں۔ اور خصائلِ انسانی کے فطری خواص ایسے موثر اور دلکش پیرایہ میں بیان کئے ہیں جن سے اردو لٹریچر اب تک خالی تھا۔ شبلی بھی آزاد کا ادب کرتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ آزاد اردوئے معلّٰی کا ہیرو ہے۔ اس کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ اصلی معنوں میں ایک زبردست انشا پرداز ہے۔ آزاد مرحوم کی وفات پر مولانا شبلی نے دارالعلوم کے صدر ہال میں جو لکچر طلبا کے سامنے دیا تھا۔

دس کا پہلا فقرہ تھا "آج اردو کا خدمۂ سخن ہو گیا!"

نذیر احمد کمال پہ پہونچ کر جس سے اصلاح لینا فخر سمجھیں۔ حالی جس کی مدح میں رطب اللسان نظر آئیں۔ شبلی نے جس کی خدمت زبان کا بارہا اعتراف کیا۔ یہ سب جھوٹے لیکن ہمارے فاضل مضمون نگار سچے۔ سہ

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات
دے اُن کو نہ دل اور تو دے مجھکو زبان اور

آج مولانا شبلی کے معمولی سے معمولی جملہ پر تنقید کی جائے تو ہندوستان میں شور برپا ہو جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شبلی اکاڈمی اور دارالعلوم ندوہ قائم ہیں۔ اور فضائے ہند میں مولانا شبلی کے بہت سے قابل شاگرد سانس لے رہے ہیں۔ بخلاف اس کے نذیر احمد، حالی اور آزاد ... ... کے شاگردوں کی تعداد اتنی نہیں سنہ ۲۳ء میں جب کہ رسالۂ اردو اورنگ آباد میں شعر العجم پر تنقید شائع ہورہی تھی تو پروفیسر ڈاکٹر اقبال حافظ محمود شیرانی صاحب اور ایڈیٹر رسالہ اُردو پر بڑی لے دے ہوئی۔ مگر نتیجہ معلوم!

آزاد کی "شاعرانہ نثر" نذیر احمد کی "سوقیانہ تحریر" اور حالی کی "عامیانہ عبارت" سے خوشہ چینی کرنے کے بعد اگر شبلی کی اردو "اردوئے خاصہ" بن سکتی ہے تو اندر سبھا، گل بکاؤلی، اور قصہ طوطا مینا پڑھنے کے بعد ہر شخص اُردوئے خاصہ لکھ سکتا ہے۔ مضمون نگار

کی اس انوکھی تاویل اور نرالی منطق کے قربان جایئے، جیسے مضمون نگار کو کسی بیرونی یا اندرونی خوف سے مرعوب نہ ہونا چاہیئے تھا۔ کم از کم مجھے تو یہ امید ہے کہ آزاد، نذیر احمد اور حالی کی عزت ہمارے مضمون نگار صاحب کے دل میں اتنی کم نہ ہوگی جتنی ان کے طرز تحریر سے معلوم ہوتی ہے۔ انھیں چاہیئے تھا کہ علمی بحث میں بالکل غیر جانب دار رہ کر فیصلہ کرتے نہ کہ کسی دنیاوی اثر سے مرعوب ہو کر اپنے ضمیر کا خون کر دیتے اور نذیر احمد حالی و آزاد جیسے بزرگوں کی شان میں جنھوں نے اردو کو اردوئے معلّیٰ بنا دیا ایسی گستاخی نہ کرتے۔ یہ وہ بزرگ تھے جنھوں نے اُردو کو جو جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش تھی۔ بھاشا انگریزی اور فارسی جیسی بڑی بوڑھیوں کے پہلو میں لاکر بٹھا دیا۔ جب تک اردو زبان قائم ہے نذیر احمد کی تصانیف اسی ذوق و شوق سے پڑھی جائیں گی جیسے آج سے بیس سال پیشتر۔ جب تک اردو لٹریچر قائم ہے۔ علامہ آزاد کی نیرنگ خیال و آب حیات اسی طرح مقبول رہیں گی۔ جیسے آزاد کی زندگی میں۔ مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" اور "مقدمہ شعر و شاعری" کسی ستائش کی رہینِ منت نہیں یہ قیامت تک زندۂ جاوید رہیں گی۔

(نوٹ)، رسالہ الناظر لکھنؤ نے اس موضوع پر کہ "آزاد، حالی، شبلی اور نذیر احمد" میں سے کس نے اردو کی زیادہ خدمت کی، ایک روز مقابلہ کا اعلان کیا تھا، اور یہ انعام ان صاحب کو دیا گیا تھا، جنھوں نے یہ بتایا تھا کہ مولانا شبلی نے اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی

(رسالہ آفتاب کلکتہ جنوری سنہ ۱۹۲۶ء)

قسمت کا پانسہ

رامن کسان مر گیا، اس کے بیٹے سنجیون نے کرپا کرم سے فرصت پائی، اور اپنی بہن تھان کنول کو جو رنج و الم سے دیوانی ہو رہی تھی، تسلی دینے کے لئے گھر لوٹا۔ رامن کی بیوی کا چھ برس پہلے انتقال ہو چکا تھا، اگرچہ وہ آخر وقت تک اپنی بیوی کی موت کو نہ بھول سکا مگر بیٹے اور بیٹی کی نگہداشت سے اُسے کچھ اطمینانِ قلب ضرور میسّر تھا مرنے کے پہلے رامن نے سنجیون کو وصیت کرتے ہوئے کہا "بیٹا میں اپنی زمین اور مکان اس امید پر تیرے سپرد کئے دنیا سے جا رہا ہوں کہ تو جفاکشی اور محنت سے اپنی نیک نامی اور شہرت کو بڑھائے گا، میں نے اپنی کوشش کے بل پر خاندان کے نام کو روشن کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ تو خاندان کی شہرت کو چار چاند لگا دیگا۔ میں تجھے خاص طور پر ہدایت کرتا ہوں کہ تھان کنول کا پورا پورا خیال رکھنا۔ جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے، اس وقت تک اپنی شادی مت کرنا۔ کیونکہ اگر تو نے شادی کر لی، تو بہت ممکن ہے کہ تیری بیوی کنواری نند کو اچھی نظروں سے نہ دیکھے۔"

تھان کنول کو مخاطب کرتے ہوئے رامن نے کہا۔ "یہ لفافہ

لے ، اس میں ایسی ہدائتیں موجود ہیں، جو تجھے ایک ایسی جگہ پہونچا سکیں گی ، جہاں میں نے تیرے جہیز کے لئے بہت سا سونا چھپا رکھا ہے ، لیکن اس لفافہ کو اپنی شادی کے موقعہ پر کھولنا۔ اس وقت تک تیرا بھائی تیری پرورش کریگا۔ اور تیری تمام ضرورتوں کا کفیل ہوگا۔ اپنے لئے ایسے شوہر کا انتخاب کرنا، جو تیری خوبیوں کی بنا پر تجھ سے شادی کرنے پر رضامند ہو۔ ایسے آدمی سے ہرگز شادی نہ کرنا، جو تیری دولت کو دیکھ کر شادی کا خواستگار ہو۔ اس لفافہ میں جس جہیز کا حال لکھا ہے وہ تم دونوں میاں بیوی کو تمام عمر کے لئے کافی ہوگا۔

(۲)

رامن کی موت کو چھ سال گزر گئے، سنجیوں نے بڑی ترقی کر لی ہے۔ لیکن اس کی بہن عسرت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ اگرچہ اس کا شوہر لچھمن شریف خاندان کا لڑکا ہے۔ مگر تیرگیٔ روزگار کے ہاتھوں مفلسی اور ناداری کے باعث پریشان حال ہے۔

ننھاں کنول کی اور لچھمن کی شادی کی بات پکی ہوگئی، سنجیون کا خیال تھا کہ میرا بہنوئی جہیز کو بڑی عقلمندی سے کام میں لائے گا۔ لیکن جب ننھاں کنول اس لفافہ کو نکالنے گئی، تو معلوم ہوا کہ شومیٔ قسمت سے کیڑوں مکوڑوں نے اُسے چھلنی کر دیا ہے، اس واقعہ سے ننھاں کنول کے سر پر آسمان پھٹ پڑا، اس نے نہایت حسرت و یاس سے لچھمن کو

اس واقعہ کی اطلاع دی، اور کہا، بہتر یہی ہے، کہ تم مجھ سے شادی نہ کرو لچھمن نے بڑی بلند ہمتی سے کام لے کر تھان کنول کی بات ہنسی میں ٹال دی۔ شادی ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی افلاس کی زندگی بسر کرنے لگے۔ ان کے دو بچے پیدا ہوئے، ایک کا نام چین اور دوسرے کا نام کوٹن تھا، سنجیون ہمیشہ ان کی مدد کرتا تھا، مگر بدقسمتی کا برا ہو کہ لچھمن کی ان تھک کوششوں کے باوجود مصائب کا خاتمہ نہ ہوا، سنجیون نے بھی شادی کر لی تھی، اس کی بیوی کا نام پاربتی تھا، اس کا عمل اس فلسفہ پر تھا، کہ خیرات گھر ہی میں شروع ہوتی ہے اور گھر ہی میں ختم ہو جاتی ہے۔

یہ وقت سنجیون کے لئے بڑی آزمائش کا تھا، پہلے تو وہ چوری چھپے اپنی بہن کی مدد کرتا رہا۔ بعد میں یہ صورت بھی باقی نہ رہی، تھان کنول اور اس کے ننھے ننھے بچوں کے آگے فاقہ کا مہیب دیو منہ پھاڑے کھڑا تھا، لچھمن محنت مزدوری کرنے والا آدمی تھا۔ مگر جب پیٹ بھر کھانے ہی کو نہ تھا تو مزدوری کیسے ہوتی؟

ایک دن چیلن نے کوٹن سے کہا۔ ”کوٹن اماں اور بابا سے کہے بغیر ہم دونوں ممانی پاربتی کے ہاں چلیں، جب اسے معلوم ہوگا کہ ہم بھوکے ہیں، تو وہ ضرور ہم پر ترس کھائے گی، یہ منصوبہ باندھ کر دونوں بچے پاربتی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔

(۳)

جیسے ہی ان پر پاربتی کی نظر پڑی، وہ غصے سے بے تاب ہو کر کہنے لگی۔

"یہاں تمھارے ہتھے کچھ بھی نہ چڑھے گا، یہ تو تمھارے باپ کا فرض ہے۔ کہ وہ تمھاری ماں اور تم دونوں کی پرورش کرے۔ جب وہ اتنا موٹا تازہ ہو کر بھی کام نہیں کر سکتا، تو تمھیں بھی دوسروں سے کوئی توقع نہ رکھنی چاہیے۔ جاؤ اپنی صورت کالی کرو۔ تمھارا ماموں یہاں موجود نہیں ہے، تمھاری اس آمد و رفت سے مجھے یقین ہو گیا۔ کہ وہ ضرور تمھاری مدد کرتا ہو گا۔ وہ کم بخت تو اب تک یہی سمجھتا ہے۔ کہ بہن کی مدد کرنا فرض ہے۔ میں تو اسے ہمیشہ کہتی رہتی تھی کہ تمھاں کنول نے ایک نکھٹو سے بیاہ رچا کر جو غلطی کی ہے، اس کا خمیازہ اسے بھگتنا چاہیے، جاؤ نکل جاؤ، پھر کبھی بدشگونی پھیلانے کے لئے یہاں مت آنا۔"

بچے پہلے سے بھی زیادہ غمگین ہو کر واپس ہوئے، جب وہ مکان کے پھاٹک کے پاس پہنچے۔ تو چیلن نے روتے ہوئے کہا:۔ "کوشن! ہم دونوں اپنے ماں باپ پر ایک بوجھ ہیں، اگر انھیں ہماری پرورش نہ کرنی پڑتی، تو وہ اچھی طرح زندگی بسر کر سکتے تھے، اگر ہم سامنے والے کوئیں میں کود جائیں، تو ہمارے ماں باپ کی مشکلات کا خاتمہ ہو جائے گا جب ہم مر جائیں گے، تو گاؤں والے ہمارا انتقام لے لیں گے، وہ ممانی

پاربتی کو بری طرح گاؤں سے نکال باہر کریں گے۔ چھوٹے بھائی نے روتے ہوئے بڑے بھائی کے منصوبے کے سامنے سر جھکا دیا۔ دونوں بھائی گلے ملے۔ اس کے بعد کوٹن کنوئیں کی منڈیر پر کھڑا ہو گیا، چیلن نے بڑی ہمت کر کے اُسے دھکا دے کر اندر گرا دیا۔ اور اس کے بعد خود بھی کود پڑا، لیکن انھوں نے جو سمجھا تھا اس کے بالکل برعکس ہوا، کنواں مدتوں سے سوکھا پڑا تھا، اور نہ ہی کیچڑ جمی ہوئی تھی، اس سے وہ بہت گھبرائے، مگر انھیں کوئی چوٹ نہ آئی۔ اِدھر یہ لڑکے کنوئیں میں تھے۔ اُدھر سنجیون نے جسے اس واقعہ کا کوئی علم نہ تھا، اس دوران میں اپنی بہن کے ہاں چاول، دال اور ضروریاتِ زندگی کی دوسری چیزیں پہونچا دی تھیں، بچے اب تک واپس نہ آئے تھے، ماں کی مامتا مشہور ہے۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنے بھائی سے کہا۔ "پیارے سنجیون! اب تک چیلن اور کوٹن واپس نہیں آئے۔ پہلے انھوں نے کبھی اتنی دیر نہ لگائی تھی، کیا تم ذرا باہر جا کر انھیں دیکھو گے؛ وہ بہت دور نہیں گئے ہوں گے"

سنجیون کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر بچوں کو ڈھونڈنے لگا، دریافت کرنے سے اُسے پتہ لگا، کہ بچے اس کے گھر آئے تھے، سنجیون کا مکان گاؤں کے دوسرے سرے پر تھا، وہ سمجھا کہ شاید بچے وہاں موجود ہوں گے پھر خیال آیا کہ پاربتی نے ان سے ضرور بُرا سلوک کیا ہو گا، یہ خیال آتے ہی وہ فوراً گھر کی طرف روانہ ہوا، وہ ابھی بیرونی پھاٹک پر پہونچا ہی تھا

اور چاہتا تھا، کہ گھر میں داخل ہو، اتنے میں چیخوں کی آوازیں آنے لگیں، وہ رُک گیا۔ اور چاروں طرف دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا، پورے احاطے میں کوئی نظر نہ آیا، یہاں کوئی ایسی جگہ نہ تھی۔ جہاں کوئی چھپ کر بیٹھ سکتا۔ لیکن چیخنے کی آوازیں لگاتار آ رہی تھیں، سامنے کنواں تھا، کنوئیں پر نظر پڑتے ہی اسے خیال آیا کہ ضرور وہیں سے آوازیں آ رہی ہیں، وہ دوڑا اور کنوئیں میں جھانکنے لگا، اس کی نگاہیں اپنے بھانجوں پر جم گئیں، وہ ڈر کے مارے چیخ رہے تھے۔ چند پڑوسیوں کی مدد سے بچے فوراً باہر نکال لئے گئے، کنوئیں سے نکلنے کے بعد جیلیں نے پوری کہانی اپنے ماموں کو سنا ڈالی، اور بتایا کہ اس کنوئیں کی تہ میں کوئی سخت سی چیز ہے۔ ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ بچوں کی تلاش میں نتھان کنول اور لچھمن بھی آ پہونچے، بچوں سے مل کر ماں باپ کا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ بچوں کے بیان کی تصدیق کرنے کے لئے لچھمن اور سنجیون کنوئیں میں اترے۔ وہاں ایک پرانا لوہے کا صندوق ملا، صندوق کو رسیوں کی مدد سے باہر نکالا گیا۔ جب اُسے کھول کر دیکھا گیا، تو وہ اشرفیوں سے لبالب تھا، اب معلوم ہوا کہ اصل میں نتھان کنول کا جہیز یہ تھا۔ (انگریزی سے ترجمہ)

مصور بمبئی افسانہ نمبر
اکتوبر ۳۶ء

نرمل گیان

جب لالچ کے دیوتا مارا کا شیطانی لشکر مہاتما گوتم بدھ کو ان کی راہِ عمل سے نہ ہٹا سکا، تو مارا بہت غمگین ہوا۔ اس نے لکڑی سے ریت پر تین لکیریں کھینچیں، ریت میں سے اس کی تینوں بیٹیاں رتی، آرتی اور ترشنا برآمد ہوئیں۔ جب انھوں نے اپنے باپ کو اس حال میں دیکھا تو اپنا سر پیٹ لیا۔

باپ نے کہا "میں ایک یوگی سے ہار چکا ہوں۔ میرا بل اور میری ساری چترائی اس کے مقابلے میں ہیچ ثابت ہو چکی ہیں۔"

ترشنا نے کہا "ہم حسین ہیں اور دل کو لبھانا خوب جانتی ہیں۔"

آرتی نے کہا "ہم اس کو اپنی محبت کے جال میں پھانس کر آپ کے قدموں میں بھینٹ چڑھائیں گے۔"

رتی نے کہا "پتاجی! گھبرائیے نہیں، ہم ابھی جا کر اس کی تپسیا بھنگ کیے دیتی ہیں۔"

مہاتما بدھ بڑ کے پیڑ کے نیچے دھیان میں مگن بیٹھے تھے، تینوں بہنوں نے پاس آ کر گانا شروع کیا۔

اے دوست بسنت آ گئی ہمیں خوشیاں منانی چاہئیں،،

اے دوست تیری آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی ہیں۔ اور اُن سے عجیب روشنی نکل رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ہم دیوتاؤں اور انسانوں دونوں کو خوش کرنے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

اے دوست اپنی بھری جوانی سے جی بھر کے مزے اُٹھا لے،،

گیان دھیان کی ان ساری باتوں سے اپنے دماغ کو پاک کر لے،،

"ہم تینوں کی طرف دیکھ۔ جن میں محبت انگڑائی لے رہی ہے،،

"ہمارے پنکھڑیوں جیسے نازک ہونٹوں کو چوس، ہمارے اُبھرے ہوئے جوبنوں پر نظر ڈال،،

"ہماری رفتار سارس کی چال سے زیادہ متوالی ہے،،

"ہمارے گیت ساری دنیا کو مست کر دیتے ہیں۔ ہمارے رقص زمانے کو دیوانہ بنا دیتے ہیں،،

"اے دوست ہمیں اسطرح نہ ٹھکرا۔ جو ملے ہوئے خزانے کو لات مار دیتا ہے۔ وہ بیوقوف ہے،،

"اے مالک ہماری طرف دیکھ۔ ہم تیری داسیاں ہیں،،

مہاتما بدھ نے نظر اُٹھا کر ان پری چہرہ دوشیزاؤں کو دیکھا ان کی نگاہ پڑتے ہی ان سب کا حسن و شباب کافور ہو گیا۔ اور یہ فتنۂ عالم لڑکیاں چشم زدن میں بڑھیا بن گئیں۔

عندلیب بمبئی

ہیئتِ اجتماعی کی پائیداری

زمانۂ قدیم سے مذاہب کے سبب انسان میں تین اعتقاد موجود ہیں۔ ان میں سے ہر عقیدہ قوموں کی مضبوطی اور ہیئت اجتماعی کی پائیداری کے لئے آبادی اور مدنیت و ترقیات امم و قبائل کے لئے محکم بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی عقائد ہیں جن سے وہ شر و فساد وارد ہوتے ہیں، جو جماعتوں کی تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ان تینوں عقائد میں سب سے اول اور افضل یہ ہے کہ انسان زمین پر فرشتہ اور اشرف المخلوقات ہے۔ دوسرا یہ کہ اپنا مذہب بقیہ تمام مذاہب سے اچھا ہے، اور اپنے مذہب کے سوا دوسرے مذاہب باطل ہیں۔ تیسرا یہ کہ انسان اس دنیا میں کماحقہ کمالات حاصل کرنے آیا ہے۔ اور اس دنیائے تنگ و تاریک سے ایک ایسی دنیا میں منتقل ہو جائے گا، جو دنیائے آب و گل سے افضل و اعلیٰ ہے اور جس کے سامنے موجودہ دنیا کو بیت الاحزان کہنا بجا اور درست ہے

ان عقائد ثلاثہ کے اس اہم الشان تاثرات سے غافل نہ ہونا چاہئے جو ہیئت اجتماعیہ میں ظاہر ہوئے، اور جن سے دنیا کو بڑے بڑے فائدے پہونچے، ان میں سے ہر عقیدہ گویا قوموں نے ردا

نوعِ انسانی کی بقا، افراد کی زینت، اور انھیں آپس میں مسالمت و مصالحت سے رکھنے کا ضامن ہے۔

انسان کا ایک عقیدہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات ہے چنانچہ وہ بہیمانہ خصلتوں سے اپنے آپ کو بالاتر سمجھ کر ان سے نفرت کرتا ہے۔ بلاشک یہ اعتقاد جتنا محکم ہوتا جائے گا یہ حجاب اور زیادہ بڑھتا جائے گا اور انسان ترقیِ عقل کے مطابق مدارج مدنیت میں ترقی و عروج حاصل کرے گا۔ اسی قدر اس متمدن جماعت میں سے وہ فرد جو فاضل ہوگا۔ اپنے بھائیوں کے ساتھ محبت، حکمت اور انصاف کا برتاؤ کرے گا یہی حکما کی غایتِ مراد اور انسانیت کی معراج سعادت ہے۔ یہی اعتقاد انسان کو چوپایوں کی طرح زندگی بسر کرنے اور جانوروں کی طرح عیش کرنے سے روکتا ہے اور یہی عقیدہ انسان کو صفاتِ خبیثہ و دنیّہ سے باز رکھتا ہے اور قوائے عقلیہ کے استعمال میں بہترین ہنر کا کام دیتا ہے۔ غور کرو۔ اگر یہ عقیدہ قوموں اور جماعتوں میں نہ ہو بلکہ یہ اعتقاد ہو کہ انسان جانوروں سے پست تر ہے، تو پھر انسان سے کیسے بڑے کام اور کیسی کیسی شرارتیں ظہور میں آئیں گی۔

اس یقین کا کہ اپنی قوم جملہ اقوام سے بہتر ہے اور ماسوا سب باطل ہیں۔ یہ نتیجہ نکلے گا کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا شخص تمام قوموں سے بحث و مقابلہ کے لئے تیار ہو جائے گا۔ اور ان سے ہمسری کے لئے تن کر کھڑا ہو جائے گا۔ اور میدانِ فضائل میں سب سے آگے بڑھنے

کے لئے کوشاں ہو گا۔ وہ اپنی قوم کا انحطاط اور اس کی ذلت و درماندگی سے کبھی خوش نہ ہو گا۔ کیونکہ اس اعتقاد کی بدولت کہ اپنی قوم جملہ اقوام سے بہتر ہے۔ وہ یہ سمجھے گا کہ ان فضائل کی سزاوار میری قوم ہے۔ ایسا شخص ایسے تمام کاموں کو جن میں فضیلت، مدنیت اور شرف ہو، اپنی قوم کا حق سمجھے گا۔ اگر خارجی اثرات کی وجہ سے اپنی قوم میں فضائل کے کسی حصہ میں بھی کمی دیکھے گا۔ تو اسے ہرگز راحت نہ ہو گی۔ بلکہ جب تک وہ زندہ رہے گا اپنی قوم کے سنوارنے کی کوشش میں مصروف رہیگا۔ پس یہ عقیدہ میدان مدنیت میں قوموں کو مقابلہ کا شوق دلانے کا سب سے بڑا ضامن اور طلب علوم و معارف اور صنعتیں سیکھنے پر آمادہ کرنے کا سب سے بڑا محرک ہے۔ اگر کسی قوم میں یہ اعتقاد نہ ہو تو فضائل حاصل کرنے کی راہ میں بیشمار مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ اور افراد قوم کی ہمتوں میں لاانتہا پستی آ جائے گی۔

تیسرا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں کمالات حاصل کرنے آیا ہے۔ تاآنکہ وہ ایک ایسے عالم میں منتقل ہو جائے جو اس دنیا سے اعلیٰ و افضل ہے۔ جس شخص کا یہ عقیدہ ہو گا۔ وہ ہمیشہ اپنی عقل کو معارف حقہ اور سچے علوم سے روشن کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور اپنی عقل کو بے کار نہ ہونے دیگا۔ وہ کوشش کرے گا کہ جو کچھ ودیعہ میں نہاں ہو اسے قوت فعلیہ سے اچھے کاموں اور عمدہ خاصیتوں کے ساتھ لوگوں کی کوشش سے پردۂ عدم سے نکال کر منصۂ شہود پر جلوہ دے اور تمام

عمراً اپنے نفس کو برے خصائل سے باز رکھے، ایسا شخص جھوٹ، حیلہ بازی خیانت اور خوشامد سے پرہیز کرے گا اور صرف جائز راستوں پر چلے گا، اور باطل سے اجتناب کرے گا۔

پس یہ عقیدہ انسان کو مدنیت کی طرف دعوت دینے والا ہے اور ظاہر ہے کہ مدنیت کی بنیاد معارف حقہ اور اخلاق مہذبہ پر قائم ہے اور یہ ہیئت اجتماعیہ میں بہترین ستون ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو مختلف انسانی جماعتوں کو آپس میں امن و آشتی سے رکھنا اور ظلم و ستم سے نجات دے کر اعلیٰ تمدن کے عرش سعادت پر بٹھا دینا ہے خیال کرو اگر کسی جماعت میں یہ عقیدہ نہ ہو تو اس میں کس قدر شقاق و نفاق اور دروغ گوئی اور حیلہ سازی اور مجادلہ و مقابلہ شروع ہو جائے گا۔ اور نتیجہ یہ ہوگا کہ معارف حاصل کرنے میں بے حد سستی آجائے گی۔

(علامہ جمال الدین افغانی کے ایک مقالے کا فارسی سے ترجمہ)

”رسالہ کائنات“

لاہور

عورتیں اور اخبار نویسی

حال میں ایک نہایت معزز خاتون نے جو کافی طور پر تعلیم یافتہ ہیں، مجھ سے استفسار کیا کہ کیا موجودہ زمانہ میں کوئی خاتون اردو صحافت کو پیشہ بنا کر خوشگوار زندگی بسر کر سکتی ہے۔ میں نے ان محترم خاتون کو جو جواب ارسال کیا، اس کا اختصار میں یہاں پیش کرنا اس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ دوسری بہنیں بھی اس خیال خام سے باز آئیں "خیال خام" کہنے کی مجھے اس لئے جرأت ہوئی کہ میرا تلخ تجربہ مجھے یہی بتاتا ہے، بہت ممکن ہے کہ دوسرے اصحاب کا تجربہ کچھ اور ہو، لیکن میرا تجربہ یہی ہے۔ کیونکہ ملک کی بدنصیبی سے اخبار نویسی کی راہ ترقی میں جو سب سے بڑا روڑا ہے، وہ یہاں کے انواع و اقسام کے قوانین و ضوابط ہیں۔ جن کی موجودگی میں کوئی آزاد اخبار خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ کیوں نہ ہو، ہرگز زندہ نہیں رہ سکتا، اگر کسی نہ کسی طرح وہ چل بھی رہا ہے تو یہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ سخت مالی مشکلات کا مقابلہ کر رہا ہے۔ یا کوئی "دست غیب" اس کی مدد کر رہا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ ملک تعلیمی لحاظ سے نہایت پست ہے۔ یہاں اخبار پڑھنے والوں کی بہت کمی ہے۔ چنانچہ اخبار کی اشاعت اتنی کافی نہیں ہوسکتی کہ

وہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے۔ تیسری مشکل اخبار کے ایجنٹ ہیں جن میں بہت بڑی تعداد ایسے بزرگواروں کی ہے جو اخباروں کی قیمت ہضم کر جانا اپنا خاص شعار سمجھتے ہیں۔ ایک اور مصیبت یہ ہے کہ ہندوستان میں تجارت کو بذریعہ اشتہارات بڑھانے کا رواج اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہے کہ اخبارات اس مد سے خاص فائدہ اٹھا سکیں اس طرح کی اور کئی مشکلات ہیں جن کا مقابلہ کرنا بڑی مصیبت ہے، چونکہ میں خود روزانہ و ہفتہ وار اخبارات کے ادارۂ تحریر میں رہ کر اور خود اپنے اخبارات نکال کر ہر طرح اس میدان کا تجربہ حاصل کر چکا ہوں، اس لئے شاید میں یہ کہنے میں قطعی طور پر حق بجانب ہوں کہ جب مردان مصائب کا مقابلہ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں اور حتی الامکان کوشش کر کے بھی کامیاب نہیں ہو سکتے تو پھر ہماری محترم خواتین کس طرح اس میدان میں کامیابی کا تصور کر سکتی ہیں۔ اگر ہماری کسی بہن کے سر میں یہ سودا ہے کہ وہ فن اخبار نویسی کو مستقل طور پر اپنا پیشہ بنائیں تو موجودہ صورت میں انھیں یہ خیال دل سے دور کر دینا چاہئے البتہ شوقیہ مضمون نگاری میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ یہ امر ان کی علمی و سیاسی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہوگا۔

من انچہ شرط بلاغ است با تو می گویم

"عصمت دہلی"
ستمبر ۱۹۳۳ء

ہوابازی کی ترقی

شاید دنیا کی کوئی قوم ایسی نہ ہوگی۔ جس میں ہوا میں اڑنے کا تخیل موجود نہ ہو۔ مختلف قوموں کی قدیم کہانیوں میں دیوتاؤں کا ہوا پر اڑنا۔ پری اور پری زادوں کی پرواز، اور اڑن کھٹولے پر فضائے آسمانی میں چکر لگانے کے قصے عام طور پر پائے جاتے ہیں، ہندوستان یونان اور مصر جیسے قدیم متمدن ممالک میں بھی اس تخیل کی گرم بازاری تھی، ہمارے ملک کی قدیم کتابوں یعنی رامائن اور پرانوں میں بھی اس کا ذکر موجود ہے۔ سری رام چندر جی اسی "ومان" پر سوار ہو کر لنکا سے اجودھیا تشریف لائے تھے، ہنومان جی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک پہاڑ کو جس پر "سنجیون" بوٹی اگتی تھی، ہاتھ میں لئے ہوا پر اڑتے آئے تھے،

لیکن جیسے جیسے دنیا آگے بڑھتی جاتی ہے یہ افسانے حقیقت کے لباس میں جلوہ گر ہونے لگے ہیں، اور عہدِ حاضرہ کی حیرت انگیز ترقیوں سے یہ امر بالکل بعید نہیں کہ ایک زمانہ آنے والا ہے، جب کہ وہ ایجادات و اختراعات جنھیں دیکھ کر آج ہم حیرت سے دانتوں تلے انگلی دبا لیتے ہیں، بازیچۂ طفلاں بن جائیں گی

ہوائی جہاز کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ سترھویں صدی عیسوی میں "المرس" نامی ایک پادری جو اسپین کا باشندہ تھا، ایک فرلانگ تک ہوا میں اڑا۔ پروگھا کے ایک دوسرے باشندے نے اسی صدی میں ہوا میں اڑنے میں خوب نام پیدا کیا تھا، انگلستان کے شاہ جیمس اول کے عہد حکومت میں ایک اطالوی نے فرانس تک پرواز کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ مگر اسے بدقسمتی سے اپنے ارادہ میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر وہ غریب صرف ناکام ہی رہ جاتا تو کوئی بات نہ تھی، ستم یہ ہوا کہ اس خبط میں اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں۔ اس نے اِس مصیبت کی وجہ یہ بتائی، کہ اس کے "پروں" میں مرغی کے کچھ پَر آ گئے تھے، اگر وہ خالص گدھوں کے پر سے تیار کئے جاتے تو یقیناً کامیابی ہوتی۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اور پرندوں کی بہ نسبت گدھ کے پروں میں قوتِ پرواز اور بوجھ سنبھالنے کی طاقت بہت زیادہ ہے۔ بیکن نے اپنی تاریخ طبیعات میں اس موضوع پر کچھ بحث کی ہے۔

سنہ ۱۶۶۰ء اور سنہ ۱۶۷۸ء میں "الرڈ" اور "لبنیر" نے ہوا میں اڑنے کی کوشش کی، کہتے ہیں کہ یہ لوگ اپنی کوششوں میں کچھ کامیاب بھی ہوئے تھے۔

غباروں اور ہوائی جہاز میں یہ فرق ہے کہ غبارے ہوا سے ہلکے ہوتے ہیں، اور ہوائی جہاز پرندوں کی طرح ہوا سے بھاری

ہوتے ہیں۔ عہدِ وسطیٰ میں یہ یقین کیا جاتا تھا کہ "اثیر" (ایتھر) کی ایک قسم اتنی ہلکی ہوتی ہے، کہ اگر اسے کسی برتن میں رکھ دیا جائے تو وہ ہوا میں اوپر لٹکا رہ سکتا ہے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں "راجر بیکن" نے ایک بہت پتلی دھات سے ایک گول برتن بنانے اور ایسے اس قسم کے ایتھر سے بھرنے کا قصد کیا، تاکہ اس ترکیب سے یہ غبارہ فضا میں اسی طرح رہ سکے، جس طرح جہاز پانی میں رہتے ہیں۔ سترھویں صدی تک لوگ اسی ترکیب کو ٹھیک سمجھ کر اسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اس کے بعد ایک شخص نے ایک اور نئی ترکیب نکالی۔ اس کا خیال تھا کہ تانبے کے چار بہت بڑے بالکل پتلے گنبد تیار کئے جائیں۔ جب ان سے ہوا خارج ہو جائے گی۔ تو یہ ہوا سے بھی ہلکے ہو جائیں گے۔ یہ ترکیب کرنے کے بعد ان گنبدوں کے نیچے ایک کشتی مستول کے ساتھ باندھ دی جائے اور کشتی میں ایک آدمی سوار ہو جائے۔ غرضکہ عرصۂ دراز تک لوگ اسی قسم کے خیالی منصوبے باندھتے رہے، جن میں سے بہت سے منصوبے تو یوں ہی عالمِ خیال میں فوت ہو گئے۔

غبارہ کی ایجاد

درحقیقت باقاعدہ طور پر غبارہ کی ایجاد سے ہوابازی کی اصل تاریخ شروع ہوتی ہے۔ اس کے موجد دو فرانسیسی بھائی تھے جو

۱۷۴۵ء سے تقریباً ۱۸۰۰ء تک زندہ رہے۔ انھوں نے بادلوں کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ اگر اسی قسم کی بھاپ تھیلے کے اندر بند کر دی جائے، تو ضرور وہ تھیلا ہوا میں اڑنے لگے گا۔ تجربہ کرنے کے لئے ان لوگوں نے ایک بہت ہلکے تھیلے میں دھواں بھر دیا۔ تھیلہ سچ مچ اوپر اٹھنے لگا۔ بعد میں انھوں نے پبلک کے سامنے اپنی ایجاد کا تجربہ کر کے دکھایا۔ ایک بہت بڑا سن کا تھیلا دھوئیں سے بھر اگیا۔ رسیاں کاٹتے ہی وہ اوپر اٹھا۔ اور تقریباً دس منٹ ہوا میں رہنے کے بعد ۲ میل کے فاصلے پر جا گرا۔ یہ غبارہ کی ابتدائی تاریخ ہے۔

جب پیرس میں اس تجربہ کی اطلاع پہونچی تو چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ چندے جمع کئے گئے تاکہ مکرر تجربہ کیا جائے۔ دونوں بھائی پیرس بلائے گئے۔ یہاں چارلس کی نگرانی میں باریک ریشم کا ایک غبارہ تیار ہوا۔ چارلس کی تجویز سے اس مرتبہ غبارہ کے اندر دھوئیں کے بدلے "ہائیڈروجن گیس" بھری گئی۔ یوم مقررہ کو لاکھوں آدمی جمع ہو گئے۔ رسیاں کاٹتے ہی اس زور سے غبارہ اڑا کہ تین ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر رکا۔ اتفاقاً اسی وقت پانی پڑنے لگا۔ مگر غبارہ کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی۔ یہ پینتالیس منٹ تک فضا میں منڈلاتا رہا۔ پھر پندرہ میل کے فاصلہ پر بڑے زور سے جا گرا۔ کسانوں کو اس سے اس قدر وحشت ہوئی، کہ انھوں نے اسے شیطانی کارستانی سمجھا، اور فوراً غبارہ کو پارہ پارہ کر کے ڈال دیا۔ اس وقت تک غبارہ میں کوئی انسان

سوار نہ ہوا تھا، ۱۷۸۳ء میں فرانسیسی وزیر نے پہلی بار ہوا میں سفر کیا اور اپنے تجربہ کو دُہراتا رہا۔ وہ غبارہ کے نیچے ایک انگیٹھی باندھ دیتا۔ اور ہمیشہ اس میں ایندھن ڈالتا رہتا تھا۔ اسی طرح "چارلس" نے بھی غبارہ میں عالم فضا کی سیر کی چونکہ غبارہ بہت ہلکا تھا۔ اس لئے وہ دو میل کی بلندی تک چلا گیا۔ اس بلندی سے چارلس نے آفتاب کو دوبارہ غروب ہوتے دیکھا۔

آج کل جو غبارے بنائے جاتے ہیں وہ صورت شکل اور اصول میں چارلس کے غباروں سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ برطانیہ و امریکہ جنہوں نے ساری دنیا کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ اس ایجاد سے فائدہ نہ اٹھاتے، انھوں نے اس ایجاد کو ترقی دینے اور اپنے مفید مطلب بنانے میں خوب خوب کوشش کی، یہاں تک کہ ۱۷۸۵ء میں ایک امریکن ڈاکٹر غبارے پر بیٹھ کر "انگلش چینل" سے پار اتر گیا۔ یہ گویا پہلا ہوائی سفر تھا جو سمندر پر کیا گیا۔

یورپ و امریکہ میں غبارہ کو ترقی دینے کی کوششیں ہونے لگیں، غباروں میں کئی خرابیاں تھیں۔ نہ تو وہ زیادہ طویل سفر کر سکتے تھے، نہ زیادہ وزن اٹھا سکتے تھے، زور کی ہوا میں غبارہ کا راہ بھٹک جانا امر یقینی سمجھا جاتا تھا۔ بحر اطلانٹک کو عبور کرنے کی کوششیں کی گئیں، مگر ہمیشہ مایوسی و ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غبارہ کی ایجاد سے جنگی میدانوں اور افواج میں کام لینے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ ہوابازی کی تعلیم

سکے لئے فرانس میں ایک مدرسہ کھولا گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک میں جو خونریز جنگ چھڑی تھی اس میں غباروں کے ذریعہ سراغ رسانی کی جاتی تھی۔ کئی بار صرف غباروں کی خبر رسانی سے فرانس کو فتح نصیب ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۰ء میں افریقہ والے حملہ میں بھی غباروں سے کام لینے کا بندوبست کیا گیا تھا، مگر اس تجویز پر عمل نہیں گیا۔ جب سنہ ۱۸۵۹ء میں فرانس نے اٹلی پر حملہ کیا تو غباروں سے اسے بے حد مدد ملی۔ فرانس اور جرمنی کی جنگ میں بھی غباروں نے بہت کام دیا۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر کبوتر اور غبارے اس موقعہ پر موجود نہ ہوتے، تو فرانس کا بالکل خاتمہ ہو جاتا۔"

انیسویں صدی کے اخیر میں تقریباً تمام مغربی ممالک میں ہوابازی کے مدرسے کھل گئے۔ حکومتیں ہوابازوں کی سرپرستی کرنے لگیں۔ ان کے نقائص کو دور کر کے انہیں بہتر صورت میں لانے کی ترکیبیں سوچی جانے لگیں۔ بڑے بڑے سائنسداں اس طرف متوجہ ہوئے، اور مشین کے ذریعہ آلۂ پرواز بنانے کی فکر کرنے لگے۔ حالانکہ اس ضمن میں کئی نامور ہوابازوں نے تجربے کئے، مگر کونٹ زیپلن کو اس سلسلے میں جو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی وہ کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ سنہ ۱۸۹۷ء میں اس نے ایک بہت بڑا غبارہ جسے ہوائی جہاز کہنا چاہیے بنانا شروع کیا۔ اس میں پانچ آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ اس کا ڈھانچہ المونیم کا بنا ہوا تھا، اس میں گیس کے ۱۶ بستے تھے۔ جن میں چار لاکھ

مربع فٹ گیس رکھی جا سکتی تھی۔ دو مشینیں تھیں جن میں سے ہر ایک میں سولہ گھوڑے کی طاقت تھی، سنہ ۱۹۰۰ء میں اس کا تجربہ کیا گیا۔ مگر تھوڑی دور پہونچنے کے بعد ایک حادثہ کی وجہ سے اسے روک دینا پڑا۔ دوسرا تجربہ بھی کامیاب نہ ہوا۔ لیکن تیسرے تجربہ میں اسے بے مثل کامیابی نصیب ہوئی۔ یہ غبارہ ۲۶ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کر سکتا تھا۔ ان تمام تجربوں میں حکومت جرمنی نے زیپلن کی خاطر خواہ ہمت افزائی کی۔

مختلف حکومتوں میں ہوا بازی کے الگ الگ محکمے قائم ہو گئے، ہوا بازوں کو ترغیب دینے کے لئے گراں قدر انعامات دیئے جانے لگے غرضیکہ اس فن کو ترقی دینے کی چہار جانب کوششیں ہونے لگیں۔ "رائٹ برادرس" کے ہوائی جہاز "سب میرین" نے نئی نئی اصلاحیں کیں اور انھیں نئے رنگ روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا۔

سنہ ۱۹۰۹ء سے ہوائی جہازوں میں بڑی سرعت سے ترقی ہوئی ہے۔ وہ حیرت انگیز ہے۔ حکومتوں نے اپنے مصالح سلطنت کو پیش نظر رکھ کر ہوائی جہاز کی رفتار بڑھانے کے سلسلے میں لاکھوں روپے کے انعام رکھے، آج سے بیس پچیس برس پہلے تیس پینتیس میل فی گھنٹہ کی رفتار پر عوام حیرت میں آجاتے تھے۔ لیکن آج ساڑھے تین سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرنا ہوائی جہازوں کے لئے آسان ہو گیا ہے۔

کچھ روز پہلے لوگ "پروازوں" کی خبریں سن سن کر ہنستے اور انھیں افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتے تھے۔ آج بھی ہمارے بھولے

ہمارے دیہاتی بھائی اور سیدھے سادے پرانے لوگ جنھیں عہد حاضرہ کی عجیب و غریب ترقیوں سے مطلق کوئی مس نہیں ہے۔ اس پورے بیان کو الف لیلہ کی ایک کہانی سے زیادہ وقعت نہیں دیں گے۔ بہر حال ہندوستان کی پبلک میں بھی اب کچھ نہ کچھ ہوابازی سے دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ اس وقت دہلی، کراچی، بمبئی اور کلکتہ میں ایرو کلب موجود ہیں۔ امید ہے کہ اس قسم کے کلب ملک کے مختلف مرکزی مقامات پر مستقبل قریب میں بنیں گے۔ ان مذکورہ بالا سب کلبوں کو حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہے۔

چنانچہ تین برس کے لئے تین لاکھ اکیس ہزار روپیہ منظور کیا گیا ہے۔

۲۷ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانیہ عظمیٰ میں ۱۲ منظور شدہ کلب موجود ہیں جن میں ۵۱۲ ممبر شامل ہیں۔ ان میں ۲۹۳ کو ہوابازی کا شہری لائسنس عطا ہو چکا ہے۔ اور ۱۳۰ اس لائق ہو گئے ہیں کہ انھیں لائسنس دے دیا جائے۔

گذشتہ تین سال میں ہوابازی میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے دنیا کے تمام متمدن ممالک بالخصوص برطانیہ، امریکہ، جرمنی اور فرانس نے عجیب کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان ممالک کے بہت سے جانباز ماہرین اپنے اپنے ملک کے وقار کی خاطر جان سے بھی ہاتھ دھو چکے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ مقابلہ جاری ہے۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں

ہندوستان سے انگلستان تک یعنی ۵ ہزار میل کا سفر دو امریکی ہوابازوں نے جن کا نام بروک اور اسیکلے ہے۔ سات روز میں طے کیا۔ ستمبر ۱۹۲۸ء میں یہی سفر کپتان برنارڈو نے صرف ۴½ روز میں طے کیا۔ مگر جرمنی کے "گریف زیپلن" نے جو حیرت انگیز پرواز کی ہے۔ وہ ان سے بڑھ کر ہے۔ "گریف زیپلن" بہت سے مسافروں کے ساتھ بحر اطلانتک کو عبور کر کے امریکہ پہونچا، اور وہاں سے پھر جرمنی آیا۔ جب "زیپلن" فتحمندانہ انداز سے برلن پہونچا، اس وقت اہل جرمنی کے جوش و خروش اور قومی سربلندی کی تصویر پروفیسر بزجی مقیم امریکہ نے "وشال بھارت" میں نہایت دلچسپ انداز سے کھینچی ہے۔ پروفیسر موصوف کا بیان ہے کہ فضائی اسٹیشن کے چاروں طرف بلا مبالغہ لاکھوں تماشائیوں کا مجمع لگا ہوا تھا، اور ہر شخص پر لمحہ شاق گذرتا تھا آخر خدا خدا کر کے گریف زیپلن آسمان پر نمودار ہوا۔ اور ہر چہار طرف سے مسرت و شادمانی کے نعرے بلند ہوئے۔ زمین پر اترنے کے بعد ہوابازوں کا جو استقبال کیا گیا۔ وہ پروفیسر بزجی کے بیان کے مطابق جرمنی میں اپنی نظیر آپ تھا، حالانکہ بحر اطلانتک کو عبور کرنے کے خیال میں اس سے پہلے بہت سے ہوا باز ملک عدم کو سدھار چکے ہیں لیکن گریف زیپلن کا اس طرح بحر اطلانتک کو پار کر کے امریکہ پہونچنا۔ اور پھر اسی شان سے اپنے ملک کو واپس آنا عہد حاضرہ کی تاریخ ہوابازی میں سب سے زیادہ اہم واقعہ ہے۔ اس پرواز کے بعد مختلف ممالک

اس طرح کے بہت سے تجربے کر چکے ہیں۔

ہوابازی سے مختلف ممالک میں آمد و رفت اور تجارتی چیزوں کی درآمد و برآمد کا کام لیا جا رہا ہے۔ اور سنا گیا ہے کہ عنقریب ہندوستان کے مختلف مرکزی مقامات پر ڈاک ہوائی جہاز پر آیا جایا کرے گی، ساتھ ہی ساتھ ان مقامات پر آنے جانے کے لئے "پسنجر ہوائی جہاز" بھی کام میں لائے جائیں گے۔ دیکھنا چاہئے کہ یہ خیال کب عملی جامہ پہنتا ہے۔ مگر ہمارے خیال میں عام لوگوں کو اس سے کوئی فائدہ پہنچنے کی فی الحال امید نہیں۔ کیونکہ ریل گاڑیوں سے ہوائی جہاز کا کرایہ ہر حال میں بہت زیادہ رہے گا۔ اس سے صرف راجہ مہاراجہ اور بڑے بڑے سرمایہ دار فائدہ اٹھا سکیں گے۔ تاہم پبلک کو صبر سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ دنیا کی ہر نئی چیز سے پہلے امراو رؤسا ہی متمتع ہوتے ہیں۔ جمہور کا نمبر سب سے پیچھے آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خیال بھی ضروری ہے کہ ابھی ہوائی جہاز نے اتنی زیادہ ترقی نہیں کی ہے۔ کہ اس کا کرایہ اور ریل کا کرایہ برابر کر دیا جائے۔ ماہرین فن اس کوشش میں مصروف ہیں کہ ہوائی جہاز میں ایسی اصلاحیں کی جائیں۔ اور اتنی ترقی کی جائے کہ مسافروں اور درآمد و برآمد کی اشیاء کے کرایہ میں اتنا ہی روپیہ لگے۔ جتنا کہ جہاز اور ریل وغیرہ میں لگتا ہے۔ امید ہے کہ ربع صدی میں یہ مشکل بھی دور ہو جائے گی۔

اگر ہوائی جہازوں نے اتنی ترقی کر لی، اور اس قدر ترقی

کر لینا یقینی بھی ہے۔ تو یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح سینما نے ناٹک کی جگہ چھین لی ہے۔ اسی طرح ریل۔ جہاز اور موٹر وغیرہ کی گرم بازاری کا ہوائی جہاز کے آگے خاتمہ ہو جائے گا۔ اب ذرا اس سے بھی آگے بڑھیے۔ اور پانچ سو برس آئندہ کا تصور کیجیے۔ دنیا کی موجودہ ہنگامہ آرا ترقیوں اور ہوابازی کی دن دونی اور رات چوگنی رفتار ترقی کو دیکھیے۔ آپ فوراً کہہ اٹھیں گے کہ اس وقت کے لوگوں کے لیے مشہور شاعر سید انشاء کے ہوائی گھوڑے کی طرح ایک ہی دن میں کلکتہ میں ڈنر اڑانا اور لندن میں ٹفن کھانا کوئی مشکل بات نہ ہوگی۔ اس وقت کلکتے کے کیلے۔ ناگ پور کے سنترے۔ اور کشمیر کے تازہ سیب و انگور جو صبح توڑے جائیں گے۔ شام کو لندن، پیرس، وائنا، جنیوا۔ نیویارک اور واشنگٹن میں بکتے ہوئے نظر آئیں گے، وہ دنیا یہ دنیا نہ ہوگی۔ جس طرح اس وقت ہندوستان، ایران، افغانستان، چین و جاپان وغیرہ وغیرہ الگ الگ ملک ہیں۔ اس عہد میں یہ ممالک الگ الگ ملک نہ سمجھے جائیں گے۔ بلکہ جس طرح آج ہندوستان کے بنگال، پنجاب، یوپی اور سی۔ پی وغیرہ صوبے ہیں، اسی طرح اس زمانہ میں ایک مجموعۂ ملل قائم ہوگی۔ جس میں امریکہ، چین، جاپان، ہندوستان فرانس، جرمنی، برطانیہ سب ایک ایک صوبے کی حیثیت رکھیں گے اس کی وجہ ذرائع رسل و رسائل، اور خصوصاً ہوابازی کی حیرت انگیز ترقی ہے۔ کیونکہ جس قدر ایک ملک سے دوسرے ملک یا ایک مقام

ہے دوسرے مقام کی مسافت طے کرنے میں کم وقت صرف ہوتا جا رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مقام اتنا ہی قریب ہوتا جا رہا ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہو جائے گی۔ تو مختلف قوموں کے میل جول سے جو نتائج مرتب ہوں گے۔ ان پر غور کرنے سے حیرت ہونے لگتی ہے۔

«ریاست دہلی»
سنہ ۳۲ء

حدیثِ عشق و سرمستی

حدیثِ عشق و سرمستی ز من بشنو نہ از واعظ
کہ با جام و سبو ہر شب قرینِ ماہ و پروینم

دنیا اور دنیا کی فانی مسرتیں کس قدر ناپائدار ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ انسان کی غفلتیں اور گمراہیاں بھی کس قدر محکم و استوار ہیں؟ وہ بابل و نینوا کے کھنڈروں میں جاتا ہے۔ مگر کوئی سبق نہیں لیتا وہ خراب آباد مدائن کو دیکھتا ہے۔ اور اس کی آنکھوں پر غفلت کی ایسی

پٹیاں بندھی ہوئی ہیں کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ وہ الحمرا کے افسانے اور فراعنہ مصر کی داستانیں سنتا ہے۔ لیکن اس کے کان بہرے ہو جاتے ہیں وہ پاٹلی پتر (پٹنہ عظیم آباد) کی گذرگاہوں پر چندر گپت موریہ اور مہاراجہ اشوک کے جبروت و جلال کی ارتھی نکلتے دیکھتا ہے اور دیکھ کر ان دیکھا بن جاتا ہے۔ وہ اجین کی سیر کرتا اور چھتر پتی مہاراج بکرما دت کے راج سنگھاسن کو سرنگوں دیکھتا ہے اور دیکھ کر آنکھیں موند لیتا ہے، اسے مانڈو گڈھ کا قلعہ اور اس کے پرشوکت محل، پٹھان بادشاہوں کی عظمتِ رفتہ کے ماتم میں سر دھنتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن وہ عبرت ہنیں پکڑتا۔

وہ نہ تو ہستناپور، اندرپرست کے ٹوٹے ہوئے راج محلوں سے کوئی پاٹھ پڑھنا چاہتا ہے، اور نہ اکبر آباد و فتح پور سیکری کی ویران عمارتوں سے کچھ سیکھنا چاہتا ہے۔ اور نہ حوادث سماوی و ارضی کو خاطر میں لاتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ آہ! انسان کتنا غافل واقع ہوا ہے ؎

نسیمِ غفلت کی چل رہی ہے اٹھ رہی ہیں غضب کی نیندیں
کچھ ایسے سوئے ہیں سونے والے کہ جاگنا حشر تک قسم ہے

انسان اگر چاہتا ہے تو یہ چاہتا ہے کہ لمبی داڑھی بڑھائے، عبا و قبا اور جبہ و ہزار دانہ کی تسبیح سے مسلح ہو کر لوگوں پر حملہ کرے؛

لوگ اس کی صورت دیکھتے ہی دین کا سردار سمجھنے لگیں اور اس کی ہر بات پر "جی مولوی صاحب بجا و درست" کے نعرے لگائیں۔ اور اس کے کھانے کے لئے پلاؤ، قورمہ اور متنجن ہر روز بلا ناغہ پیش کرتے رہیں خواہ مولوی صاحب کی خدمت کرتے کرتے جناب ممدوح کے نیازمندوں کا دیوالہ ہی کیوں نہ نکل جائے"

وہ چاہتا ہے کہ زلفیں بڑھائے۔ ان میں ہر روز صبح سویرے ٹکے کا خوشبودار تیل ڈالے، مشکی گلوری چبائے، اور پان کے لاکھے پر مسّی کی دھڑی جمائے اور آنکھوں میں انجن کی سلائی پھرا کے مریدوں کے حلقہ میں آن بیٹھے اور کسی خوش گلو، زہرہ جبین کے منہ سے عراقی کی غزلیں سنے۔ چونکہ وہ صوفی ہے۔ اس لئے اس کے لئے سماع حلال ہے اور چونکہ وہ عالم ناسوت سے مدتوں پہلے گذر چکا ہے۔ اور عالمِ جبروت و ملکوت کو بھی بہت پیچھے چھوڑ کر اب عالمِ لاہوت کی سیر کر رہا ہے۔ اس لئے وہ آپے میں نہیں، اور اس عالم میں بھلا کون آپے میں رہ سکتا ہے؟ اس کا دل اس وقت ایک آئینہ ہے جس میں ہر طرف سے صورتِ جاناں جلوہ گر ہے۔ بقول شاعر ؎

چاروں طرف سے صورتِ جاناں ہو جلوہ گر
دل تیرا صاف ہو تو ہے آئینہ خانہ کیا؟

اگر کبھی کوئی گستاخ مرید ڈرتے ڈرتے پوچھ لیتا ہے کہ حضرت

فرائض دینی میں سے آپ کوئی فرض ادا نہیں کرتے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ تو نابکار مرید کی اس گستاخی پر حضرت کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھتا ہے۔ حضرت صوفی صاحب یہ سنتے ہی ایسے جلال میں آ جاتے ہیں کہ گستاخ مرید ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتا ہے۔ صوفی صاحب کی آنکھیں غصہ سے انگارے کی طرح لال ہو جاتی ہیں۔ اور وہ سانپ کی طرح بل کھا کر نعرہ لگاتے ہیں۔

چو زبادہ مست گشتم چہ کلیسا و چہ کعبہ
چو ترک خود گرفتم چہ وصال و چہ جدائی

وہ چاہتا ہے کہ قوم کا لیڈر بنے۔ اور ریلیف کمیٹیوں کے فنڈ کو باپ دادا کی میراث سمجھے۔ اور چندوں کو کچھ انداز سے کھائے کہ اس کی توند بجائے خود مرحوم قومی چندوں کا قبرستان بن جائے۔

وہ چاہتا ہے کہ کونسل کا ممبر منتخب ہو جائے، ممبر بننے سے اُس کو جو خوشی حاصل ہوتی ہے، شاید مجنوں کو لیلیٰ اور فرہاد کو وصل شیریں سے بھی اتنی مسرت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہمارے ایک شاعر نے ایک موقعہ پر ایک ممبر علی سجاد کے متعلق کہا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ خوب کہا تھا ؎

ممبری کیا مل گئی مسٹر علی سجاد کو

وصلِ شیریں تھا کہ حاصل ہو گیا فرہاد کو

ممبر منتخب ہونے سے اور کچھ نہیں تو کم سے کم ڈنر یا لنچ ہی کے موقعہ پر حکام وقت کی حاشیہ نشینی کی سعادت نصیب ہو جائے گی اور اگر وزارت کی پری ہتھے نہ چڑھی تو کیا ہوا۔ وفاداری کے صلہ میں کوئی خطاب ہی مل رہے گا۔

وہ چاہتا ہے کہ کسی روزانہ یا ہفتہ وار اخبار کا مالک بن جائے، اوباش راجاؤں، ظالم نوابوں اور بدمعاش دولتمندوں کی تعریف میں لمبے چوڑے آرٹیکل شایع کر کے دولت بٹورے۔ عالی شان مکان بنوائے، سیر کے لئے موٹر کار رکھے، بنکوں میں اکاونٹ کھولے اور اپنے اور اپنی اولاد کے لئے دنیا ہی کو جنت فردوس کا نمونہ بنا لے۔ اسے اس سے مطلب نہیں کہ قوم کا مردہ بہشت میں جاتا ہے یا جہنم داخل ہوتا ہے۔ وہ تو اِس اصول کا پرستار ہے کہ جی خوش جہان خوش۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ادارے میں کام کرنے والوں کی تنخواہیں شیر مادر کی طرح ہضم کر جاتا ہے، یا اگر دیتا ہے تو اس طرح دیتا ہے کہ اگر ایک شخص کی تنخواہ تیس روپے ماہانہ ہے تو وہ ان تیس روپیوں کو تیس ہزار تقاضوں کے بعد تیس مہینوں میں ادا کرتا ہے، اور اس پر بھی اسے اپنا احسان سمجھتا ہے ؎

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس قسم کا مالک اخبار اپنے "ناظرین" کے آگے بڑا پارسا بنتا ہے، لیکن حق یہ ہے کہ فی الحقیقت وہ پارسا ابلیس ہوتا ہے۔ وہ اپنے علم و فضل کی نمایش کا بھی عادی ہوتا ہے۔ مگر اکثر حالتوں میں وہ نرا گاودی اور جاہل ہوتا ہے، یا اس کی علمی لیاقت نہایت معمولی و سطحی ہوتی ہے البتہ چونکہ وہ مغربی تہذیب کے اوچھے ہتھیار یعنی پروپگنڈے کے فن سے خوب واقف ہے، اس لئے وہ شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اور چونکہ وہ "ہری چگ" ہے اس لئے اس کی جیب میں سنہری و روپہلی سکے کافی تعداد میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگ خواہ مخواہ اسے قابل سمجھنے لگتے ہیں:

وہ چاہتا ہے کہ جج کی کرسی پر جلوہ گر ہو اور جس فریق سے زیادہ رشوت ہاتھ آئے اسی کے حق میں فیصلہ بحال کر دے۔

وہ چاہتا ہے کہ وکیل بن کر بات کا بتنگڑ اور رائی کا پربت بنا کر موکلوں کو آپس میں لڑائے اور اپنا الو سیدھا کرے۔

وہ چاہتا ہے کہ اگر کسی تھانے کی تھانیداری ہاتھ نہیں آتی تو نہ سہی کم سے کم کانسٹبلی ہی کا "عہدۂ جلیلہ" ہاتھ لگ جائے تاکہ کسی بھولے بھالے راہگیر کو دفعہ ۴۴۳ میں چالان کرنے یا کسی مسافر کو آوارہ گردی کے الزام میں پھانسنے کی دھمکی دے کر مٹھی گرم کی جا سکے۔

غرض انسان جو چاہتا ہے اس کی بے شمار شکلیں مختلف رنگ

دروغن کے ساتھ مختلف صورتوں میں دنیا بھر میں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ انسانی خواہشات کا سمندر کچھ ایسا بے پایاں واقع ہوا ہے کہ اُسے کاغذی کوزہ میں بند کرنا قطعاً ناممکن ہے ؎

جو سُنے تو کوئی نہ سن سکے جو کہوں تو ختم نہ ہو سکے
یہ فسانہ زلفِ دراز کا شبِ زندگی سے دراز ہے
("دریتیم" لاہور ۲۵؍ اگست ۳۴ء)

---

(۹)
ہندوستان کے نورتن

ٹیگور ہندو فلسفہ و ہندو تہذیب کا علمبردار ہے، وہ ہندو تہذیب کو "ہندوستانی تہذیب" کے لقب سے ملقب کرتا ہے۔ اور ساری دنیا کو اسی رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتا ہے، وہ انگریزی زبان کے روحانی شاعروں، ہندوستان کے وشنوی شاعروں اور کبیر پنتھیوں سے بہت متاثر ہوا ہے، ہندو فلسفہ کے عام رجحان کے مطابق اس کے نزدیک دنیا مایا ہے۔ لہٰذا وہ انسان کو پہاڑوں کے دامن دریاؤں کے کنارے اور جنگلوں میں بانسری، جل ترنگ اور ستار بجاتے ہوئے امن و سکون سے زندگی گذارتے دیکھنا چاہتا ہے۔ دو ہزار برس

پہلے کی ہندو تہذیب اس کے نزدیک دنیا کی بہترین تہذیب ہے اس زمانہ میں ہندوستانی سوسائٹی کا جو نظام تھا، ٹیگور کے نزدیک دنیا کے لئے بہترین نظامِ حیات وہی ہے۔ چنانچہ وہ زمانے کی رفتار کو موڑ کر عالمِ انسانی کو دو ہزار برس پہلے کے ہندوستان میں لے جانا چاہتا ہے اس کے نزدیک دنیا کی تمام مشکلات سے نجات پانے کا اس کے سوا اور کوئی حل نہیں۔ چنانچہ اپنے انھیں خیالات کی اشاعت کے لئے ٹیگور نے بنگال میں "وشوا بھارتی" کے نام سے ایک دار العلوم بھی قائم کیا ہے ⁂

اقبال

یہ مفکر شاعر اسلام کی طرف سے دنیا کے آگے ایک نظریۂ حیات پیش کرتا ہے۔ وہ مغربی فلاسفہ میں نیٹشے و برگساں اور مشرقی اربابِ فکر میں رومی، ابن عربی و جمال الدین افغانی وغیرہ سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ اقبال سرمایہ داری کا بھی مخالف ہے لیکن ایک حد کے اندر! وہ سرمایہ دارانہ نظام کو حرفِ غلط کی طرح صفحۂ ہستی سے مٹانے کے حق میں نہیں، وہ بزرگانِ اسلام کی زندگی کے نمونے پیش کر کے اعمالِ صالح کے ذریعہ آدمی کو مافوق الفطرت انسان بننے کی تلقین کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اس طریقے سے تمام برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔ **اقبال** کا دعوےٰ ہے کہ اگر عالمِ انسانی اس کے پیش کئے ہوئے نظریۂ حیات کو اپنا مطمحِ نظر بنا لیا، تو دنیا کے سارے مصائب کا فی الفور خاتمہ ہو جائے گا ⁂

قاضی نذرالاسلام

شاعرِ انقلاب، نذرالاسلام کے نزدیک دنیا کی تقسیم صرف دو حصوں پر کی جاسکتی ہے۔ ایک ظالم، دوسرا مظلوم، ایک وہ جو اپنے سے کمزوروں کو اپنا غلام بنا کر اپنے مفاد کی خاطر ان سے ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جو جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑے پڑے ہیں اور اپنے سے طاقتور لوگوں کے آرام و آسائش کی خاطر ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنے ہوئے ہیں۔

اس کا خیال ہے کہ دنیا کے موجودہ اقتصادی سیاسی تمدنی و معاشرتی نظام کی بنیاد "لوٹ کھسوٹ" پر رکھی گئی ہے۔ لہٰذا جب تک دنیا میں ایک بھی ظالم موجود ہے اس وقت تک مظلوموں کو چین نہیں مل سکتا۔ چنانچہ وہ موجودہ نظام کو تباہ کر کے کائنات کے لئے ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے۔ جس میں ظالم و مظلوم دونوں کی تفریق مٹ جائے۔

مسز سروجنی نائیڈو

ایک بنگالی برہمن خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مقامِ پیدائش حیدرآباد ہے۔ ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں ہوئی، اس کے بعد لندن اور کیمبرج میں تعلیم پاتی رہیں۔ انگریزی زبان کی ایک بلند پایہ شاعرہ ہیں۔ ان کی شاعری خالص ہندوستانی جذبات کی آئینہ دار ہے۔ اس میں ہندوستان کی صحیح روح نظر آتی ہے۔ اب تک ان کے کلام کے تین

مجموعے انگریزی زبان میں شائع ہو کر عام طور پر مقبول ہو چکے ہیں۔ وقتاً فوقتاً ان کی اکثر نظموں کے ترجمے ہندوستان اور یورپ کی متعدد زبانوں میں ہوتے رہے ہیں۔ مسز نائیڈو کی شاعری حب وطن کی چاشنی سے بھرپور ہے۔ مگر ان کا حبِ وطن وہ حب وطن نہیں ہے کہ اپنے وطن کے سوا دنیا کے اور کسی ملک کے لئے دل میں جگہ نہ ہو۔ بلکہ ان کا مشن بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے وطن کو اس لئے آزاد اور خوشحال دیکھنا چاہتی ہیں کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی آزادی و خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ ان کی عملی زندگی میں بھی یہ بات قدم قدم پر نمایاں ہے۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں قطعاً بے باک ہیں، اپنی حریتِ فکر کی خاطر انھیں قید و بند کی سختیاں جھیلنے سے کوئی چیز باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جنھیں انڈین نیشنل کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ ایک خطیبہ کی حیثیت سے بھی ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے، اس وقت ہندوستان میں جو بہترین خطیب موجود ہیں ان میں مسز نائیڈو کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ وہ مشرقی افریقہ اور جنوبی افریقہ کی ہندوستانی باشندوں کی مدد کے لئے ان ممالک کا دورہ بھی کر چکی ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دنیا کے دوسرے حصوں کی بھی کافی سیاحت کی ہے۔ سنہ ۲۹-۲۸ء میں وہ ہندوستان کی طرف سے تقریریں کرنے کے لئے امریکہ و کینیڈا تشریف لے گئی تھیں۔ ان کی تقریروں

کے عام موضوع، مذہب۔ سیاست۔ معاشرت و تعلیم ہیں۔ ان کی آواز کی شیرینی۔ ان کے بیان کا دلکش انداز اور زبان کی روانی سامعین پر جادو کا اثر کرتی ہیں، موجودہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں میں انھیں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ اور سیاسی امور میں ان کی رائے کو ہمیشہ اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ بلا قید مذہب و ملت ہندوستان کے ہر طبقہ میں مقبول ہیں۔ انھیں ہندوستانی نسائیت کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے اور اہل ہند انھیں خواتین ہند کی بے تاج ملکہ کی حیثیت سے فخر کے ساتھ دنیا کی دوسری قوموں کے آگے پیش کر سکتے ہیں۔

موہن داس کرم چند گاندھی

گاندھی جی مذہباً جینی ہیں، ان کے نزدیک از روئے مذہب عدم تشدد سب سے بڑا مذہب ہے۔ انھوں نے اپنی تمام سیاسی تحریکوں میں اپنے اس اصول پر سختی سے قائم رہنے کی کوشش کی ہے۔ بلکہ جب انھوں نے تحریک ترک موالات شروع کی اور یہ تحریک آگ کی طرح سارے ہندوستان میں پھیل گئی، اور لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب ہندوستان کو عنقریب سوراجیہ مل جائیگا، تو اس وقت ایک مقام پر لوگوں کے تشدد پر آمادہ ہو جانے کی وجہ سے گاندھی جی نے تحریک ترک موالات کو ملتوی کر دیا۔ ہندوستان میں اپنی تحریکیں شروع کرنے سے پیشتر گاندھی جی کافی عرصے تک

جنوبی افریقہ کی سیاسیات میں حصہ لیتے رہے ہیں، ہندوستان آنے کے بعد وہ ایک معتدل سیاست داں کی حیثیت سے کام کرتے رہے، لیکن جب جنگِ عظیم کے خاتمہ پر ہندوستانیوں کی توقعات سے بہت کم اصلاحات ملنے کے علاوہ مسئلہ خلافت بھی مسلمانوں کے حسب دلخواہ نہ سلجھایا گیا، اور جلیانوالہ باغ میں گولیاں چلائی گئیں تو گاندھی جی نے تحریکِ ترکِ موالات اور ہندو مسلم اتحاد کا لائحۂ عمل پیش کیا۔ مولانا محمد علی۔ مولانا شوکت علی۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ مقتدر مسلم رہنماؤں نے گاندھی جی کے لائحہ عمل کی تائید کی اور سارے ہندوستان میں اس پر عمل ہونے لگا۔ لیکن جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ بعض لوگوں کے آمادۂ تشدد ہو جانے کی وجہ سے گاندھی جی کو یہ تحریک بند کرنی پڑی۔ ترکِ موالات کے بعد گاندھی جی نے دو مرتبہ ستیہ گرہ کی تحریکیں شروع کیں۔ مگر ان میں بھی انھیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ چنانچہ اب وہ سیاسیات سے علیحدگی اختیار کر کے اچھوت ادھار اور دوسرے معاشرتی کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ گاندھی جی انگریزی۔ ہندی اور گجراتی کے بہت اچھے انشاپرداز ہیں۔ وہ دورِ حاضر کے انگریزی زبان کے ان معدودے چند ہندوستانی انشاپردازوں میں ہیں، جن کی انگریزی کو انگریز بھی پسند کرتے ہیں۔ ایک مدبر اور سیاست داں کی حیثیت سے، ان کا مرتبہ نہایت بلند ہے، لیکن وہ سیاست بلکہ

زندگی کے ہر شعبہ میں خیال و عمل دونوں میں "عدم تشدد" کے اصول کے حامی ہیں۔ وہ اپنے اس اصول پر سختی سے کاربند ہیں، چنانچہ اپنی تمام تحریکوں میں وہ اس اصول پر عمل پیرا رہے۔ سیاسیاتِ عالم میں ان کی یہ خصوصیت ایک خاص حیثیت رکھتی ہے، یورپ و امریکہ اور دوسرے ممالک کے لوگ گاندھی جی کے اس اصول کی وجہ سے انھیں حیرت و استعجاب کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ ہندوستان کے اکثر جاہل اور گنوار ان کے اس اصول اور طرزِ زندگی کی سادگی کی وجہ سے انھیں ما فوق الفطرت انسان سمجھتے ہیں۔ اگرچہ گاندھی جی کی تمام تحریکیں ناکام ثابت ہوئیں، اور انھیں اپنے مقصد میں کوئی نمایاں کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی تحریکوں نے سارے ہندوستان میں ایک طرح کی سیاسی بیداری پیدا کردی اور لوگوں میں شعورِ سیاسی اور غور و فکر کا مادہ پیدا ہوگیا، چنانچہ گاندھی جی کا کوئی مخالف ہو یا موافق، لیکن کسی شخص کو ان کی عظمت سے انکار نہیں ہو سکتا۔

ہز اگزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں والئی دکن

جس طرح ریاست حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست ہے، اسی طرح اس کے بیدار مغز حکمراں ہز اگزالٹڈ ہائنس میر عثمان علی خاں اپنے تدبر و دانش اور طرزِ حکمرانی کے لحاظ سے ہندوستان کے دوسرے

تمام راجہ اور نوابوں پر تفوق رکھتے ہیں۔ ان کی ریاست رقبہ و آبادی کے اعتبار سے یورپ کی کئی چھوٹی چھوٹی سلطنتوں سے بڑی ہے۔ ریاست حیدرآباد کی سالانہ آمدنی برطانوی ہند کے دو صوبوں یعنی صوبجات متوسط و برار اور بہار و اڑیسہ کی مجموعی آمدنی سے بھی زیادہ ہے۔

ہندوستان کے کئی صوبوں اور ریاستوں کے باشندوں سے باشندگان دکن کی اقتصادی حالت کہیں بہتر ہے۔ اس خوشحالی کا پہلا سبب خود ہز اگزالٹڈ ہائینس کی ذات گرامی ہے اور دوسرے ان کے فاضل مشیر مال سر اکبر حیدری کی کوششیں ہیں۔ حیدرآباد میں ایک لیجسلیٹو کونسل بھی قائم ہے جو سرکاری و غیر سرکاری افراد پر مشتمل ہے۔ پوری ریاست دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے ایک تلنگانہ اور دوسرا مرہٹواڑی۔ پھر یہ صوبے ۱۵ ضلعوں اور ۱۰۳ تعلقوں پر منقسم کر دیئے گئے ہیں۔ حیدرآباد کا فوجی نظام ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے نسبتاً بہت بہتر ہے۔ بنگال و بمبئی کی طرح حیدرآباد میں کارخانے بھی قائم ہیں۔ ریاست کی اس دن دونی اور رات چوگنی ترقی میں شہریار دکن کے مشیران خصوصی مثلاً مہاراجہ سر کشن پرشاد۔ سر اکبر حیدری ——— نواب عقیل جنگ اور نواب مہدی یار جنگ وغیرہ کا کافی حصہ ہے۔ لیکن اگر ہز اگزالٹڈ ہائینس ان حضرات کی رہنمائی نہ فرماتے تو انہیں اپنی کوششوں میں اس حد تک کامیابی نصیب نہ ہوتی۔ تعلیمی لحاظ سے

مملکتِ دکن کی ترقی برطانوی ہند کے اعلیٰ ترقی یافتہ صوبوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس وقت ابتدائی مدارس کے علاوہ ریاست حیدرآباد میں ۴½ ہزار سے زیادہ تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ ہز اگزالٹڈ ہائنس پہلے ہندوستانی حکمراں ہیں کہ انھوں نے ہندوستان کی مشترکہ قومی زبان اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر ایک یونیورسٹی قائم کی۔ اور دوسرے مفید علمی اداروں کے ذریعہ اپنی ملکی زبان کے دامن کو مختلف علوم و فنون کے گلہائے رنگا رنگ سے بھرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ شہریارِ دکن اس وقت دنیا کے بہت سے بڑے متمول انسانوں میں سے ہیں۔ لیکن ان کی خانگی زندگی اس قدر سادہ ہے کہ وہ دوسروں کے لئے نمونہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ ایک بلند نظر ادیب و عالم اور ایک زبردست مدبر و حکمراں ہیں۔ وہ ہند و بیرونِ ہند کے بہت سے رفاہِ عام کے کاموں میں نہایت فراخدلی سے مدد کیا کرتے ہیں۔

سر جے۔ سی بوس

ڈاکٹر سر جگدیش چندر بوس ۱۸۵۸ء میں ضلع ڈھاکہ کے ایک دیہات میں پیدا ہوئے۔ سینٹ زیویر کالج کلکتہ سے بی۔ اے کی سند لی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی نیت سے انگلستان تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے کیمبرج سے بی۔ اے اور لندن سے بی ایس سی کے امتحانات پاس کئے۔ ہندوستان لوٹنے کے بعد پریسیڈنسی کالج کلکتہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی زمانے میں انھوں نے برقی

لہروں کے سلسلے میں اپنی حیرت انگیز تحقیقات سے سائنس کی دنیا میں ہلچل ڈال دی۔ اور لاسلگی (وائرلیس) کے متعلق کئی ایسی نئی باتیں پیدا کیں، جن کی وجہ سے ساری دنیا میں ان کے نام کے ڈنکے بجنے لگے۔ وائرلیس کی موجودہ ترقی بڑی حد تک سر بوس کی کوششوں کی رہینِ منت ہے۔ لیکن نباتات کی زندگی کے سلسلے میں انکی تحقیقات اپنی نوعیت کے اعتبار سے ساری دنیا میں لاجواب ہیں۔ انھوں نے نباتات کی زندگی کے متعلق اپنے نظریے کی تائید میں کئی ایسے آلے ایجاد کئے ہیں، جن سے پودوں کے مزاج کی کیفیت مثلاً رنج و خوشی اور صحت و بیماری وغیرہ کا حال آسانی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

سر جگدیش چندر نے اپنی تحقیقات جاری رکھنے کے لئے اپنا ایک علیحدہ کالج قائم کیا ہے۔ ہر سال اس کالج کا ایک سالانہ جلسہ ہوا کرتا ہے جس میں شریک ہونے کے لئے ہندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ کے علمائے سائنس بھی آیا کرتے ہیں، اس جلسہ میں سر بوس اپنے انسٹی ٹیوشن کی سال بھر کی تحقیقات کے نتائج پیش کیا کرتے ہیں۔ غرض سر جگدیش چندر اپنے فن میں نہ صرف ہندوستان بلکہ یورپ و امریکہ میں بھی بے نظیر ہیں۔

سر پی۔ سی رے

سنہ ۱۸۶۱ء میں بنگال میں پیدا ہوئے ابتدائی تعلیم کے بعد ہندوستان اور یورپ میں سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور کیمسٹری کے متعلق تحقیقات کو

اپنا نصب العین بنا کر اپنی زندگی کو اس کام کے لئے وقف کر دیا۔ انھیں ہندوستان اور یورپ کی یونیورسٹیوں سے اپنی شاندار تحقیقات کے صلے میں کئی اعزازی ڈگریاں مل چکی ہیں۔ اور انھیں متعدد علمی سوسائٹیوں کا رکن بھی بنایا جا چکا ہے۔ ان کی علمی خدمات کے پیش نظر حکومت کی طرف سے انھیں عرصہ ہوا "سر" اور "سی۔ آئی۔ ای" کے خطابات بھی عطا کئے جا چکے ہیں۔ کیمسٹری کی دنیا میں ان کی تحقیقات خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی ایسی متعدد تصانیف اور تحریریں موجود ہیں، جنھیں اس فن کے ماہر خاص وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انھوں نے بنگال کیمیکل اینڈ فارمیٹیکل ورکس کے نام سے انگریزی دوا سازی کا ایک عظیم الشان کارخانہ بھی قائم کیا ہے۔ جس میں جدید سائنٹیفک طریقوں سے تقریباً ہر قسم کی انگریزی دوا تیار کی جاتی ہے، سر پی، سی، رائے نے اس کارخانے کو قائم کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اگر موقعہ ملے تو ہندوستانی دماغ کسی کام میں یورپ و امریکہ سے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ انھوں نے اپنے ذوق علمی کی نمائش کی خاطر ایک علیحدہ سائنس کالج بھی بنایا ہے جہاں وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ علمی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ سر پی، سی رے کو متفقہ طور پر مشرق کا سب سے بڑا کیمسٹ تسلیم کیا جاتا ہے۔ علمی خدمات کے علاوہ قومی معاملات میں بھی وہ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ ملکی مصنوعات کو ترقی دینے کا انھیں بڑا شوق ہے۔ بنگال میں ملکی مصنوعات کی موجودہ ترقی بہت کچھ سر پی،

سی رے کی کوششوں کی رہین منت ہے۔ وہ متعدد کمپنیوں کے ڈائرکٹر بھی ہیں، اس لحاظ سے ان کی آمدنی بھی بہت زیادہ ہے، لیکن وہ اپنی ساری آمدنی غریب طلبہ کی امداد اور علمی کاموں میں صرف کرتے ہیں بنگال کے ہزاروں غریب لڑکوں نے محض سر پی، سی رے کی مدد سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔

سر پی، سی رے کی خانگی زندگی اس قدر سادہ ہے کہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ان کا ذاتی خرچ چند پیسوں سے زیادہ نہیں ہے۔ وہ انگریزی و بنگلہ کے فصیح البیان خطیب ایک بلند نظر انشا پرداز اور شعر و ادب کے نقاد ہونے کے علاوہ سیاسی امور میں بھی کافی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کا عزم جوانوں کو شرماتا ہے، شائد یہی وجہ ہے کہ وہ بوڑھوں سے زیادہ جوانوں کے طبقہ میں مقبول ہیں۔

سر سی۔ وی رمن

انھیں علم موجودات (فزکس) کی تحقیقات کے سلسلے میں متعدد علمی مجالس کی طرف سے تمغے اور متعدد یونیورسٹیوں کی طرف سے اعزازی ڈگریاں عطا ہو چکی ہیں۔ سر رمن پہلے انڈین فنانس ڈیپارٹمنٹ میں ایک اعلیٰ عہدے پر ممتاز تھے۔ مگر اپنے علمی شوق کی خاطر اس ملازمت کو ترک کر کے کلکتہ یونیورسٹی کے جوہر شناس وائس چانسلر سر آشوتوش مکرجی آنجہانی کی خدمت میں پہونچے، اور ان سے اپنے علمی شوق کا حال بتایا۔ سر

آشوتوش نے رمن کے علمی ذوق کو دیکھ کر ان کے لئے ایسے مواقع فراہم کردیئے کہ انھیں علمی تحقیقات کے لئے کافی وقت ملنے لگا، علم موجودات کے متعلق سر رمن نے جو حیرت انگیز تحقیقات کی ہیں۔ ان کا غلغلہ نہ صرف ہندوستان میں بلند ہے، بلکہ اُن کے نام کے یورپ و امریکہ میں بھی جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ پچھلے دنوں انھیں فزکس میں نوبل پرائز بھی مل چکا ہے۔ پورے مشرق میں ان کے فن میں " اس وقت ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔

(نوٹ) یہ مضمون ایڈیٹر صاحب نیرنگ خیال کی فرمائش پر اس اصول کے ماتحت لکھا گیا تھا کہ ان نو اشخاص میں سے کس کا کام ہمہ گیر ہے اور زمان و مکان کے تعینات پر کس نے کس حد تک فتح پائی ہے

رسالہ نیرنگ خیال لاہور۔ جون و جولائی نمبر ۱۹۳۵ء

ہندوستانی فلموں کی ناکامی کے تین بڑے اسباب

ہندوستانی فلموں میں جو نقائص پائے جاتے ہیں ان کے بڑے اور عام اسباب حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ڈائرکٹر اور ایکٹر زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔

(۲) ڈائرکٹروں اور مالکوں کے دماغ پر ادنشلزم اور اپنے اپنے

منظورِ نظر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو بڑھانے کا بھوت سوار ہے۔

(۳) ایک ایسی کہانی جو متعدد دماغوں کی کنجکاریوں کا نتیجہ ہو۔

یہ بیماریاں اتنی زیادہ بڑھ گئی ہیں کہ اب ان کا علاج فلموں کے بائیکاٹ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ جاہل اور ان پڑھ ڈائرکٹروں اور ایکٹروں کے کارناموں کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ وہ صحیح معنوں میں آرٹ کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں۔ ڈائرکٹر کا بہت پڑھا لکھا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اگر وہ زیادہ پڑھا لکھا ہوگا تو مختلف سوسائیٹیوں کی معاشرت و تمدن اور عادات و اطوار سے کماحقہ آگاہ ہونے کے علاوہ فن۔ آواز۔ روشنی اور تصویر کشی کے متعلق بھی پورا پورا علم رکھتا ہوگا۔ اگر وہ اتنا جامع حیثیات انسان نہ ہوگا تو دوسرے اداکاروں سے اچھی طرح کام نہ لے سکے گا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ تماشہ اکبر کے عہد کا دکھایا جا رہا ہے۔ لیکن ایکٹروں کے لباس بالکل آج کے زمانے کی طرح ہیں۔ تماشہ ہند قدیم کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن معاشرت موجودہ راجپوتانہ کی دکھائی گئی ہے۔ ڈائرکٹر کی جہالت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ فلم میں اس زمانہ کی معاشرت کا صحیح نقشہ نہیں کھینچ سکتا۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایسی فلمیں عام طور پر ناکام ہوتی ہیں۔ ایکٹروں کے ان پڑھ ہونے کا انجام اس صورت میں نمودار ہوتا ہے کہ وہ انسانی جذبات کی حقیقی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ مالکوں اور ڈائرکٹروں کے وطنی تعصب، جہالت اور تنگ نظری اس شکل میں بروئے کار آتی ہے کہ وہ اپنے عزیز و اقارب۔ دوست احباب اور اپنے صوبہ یا قوم کے باشندوں کو نگارخانوں میں بڑے بڑے عہدے عطا کرتے ہیں

کہانی ۔ مکالمہ اور گانے کے معاملہ میں بھی اکثر حالتوں میں اپنے دوست احباب اور قریبی رشتہ داروں کو فلمی دنیا میں مشہور کرنے کے لئے ان سے کہانیاں مکالمے اور گانے لکھوائے جاتے ہیں ۔ پھر ان سب پر جاہل مالک اور ان پڑھ ڈائرکٹر کی اصلاح آگ پر تیل کا کام کرتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی فلم اس طرح تیار ہو کر پبلک کے سامنے آئے گی تو اس کی کامیابی کا امکان کس حد تک باقی رہ جاتا ہے ۔ اکثر ہندوستانی فلموں کی ناکامی کے یہی اسباب ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج تک ہندوستان صحیح معنوں میں کوئی ایسی فلم تیار نہ کر سکا ۔ جسے بین الاقوامی شہرت نصیب ہوتی ۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں ایسے ڈائرکٹر ۔ اداکار اور فلم کی کہانی ۔ مکالمے اور گانے لکھنے والے موجود نہیں ہیں بلکہ حقیقی سبب یہ ہے کہ فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی ہے جو محض صنعت فلم سازی کی ترقی کو اپنا نصب العین بنا سکیں ، یا کم سے کم حقیقی معنوں میں صرف اصول تجارت ہی کو پیش نظر رکھ کر کام کریں ۔ اگر ڈائرکٹروں ۔ ایکٹروں اور فلمی کہانی اور مکالمے لکھنے والوں کے انتخاب میں پراونشلزم ۔ ذات پات ۔ دوستی اور رشتہ داری کا خیال رکھنے کے بجائے قابلیت و اہلیت کو معیار انتخاب قرار دیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ مستقبل قریب میں ہندوستان ایسی فلمیں تیار کرنے لگے ۔ جن کی شہرت ہندوستان سے نکل کر دوسرے ممالک تک جا پہونچے

(پارس لاہور ۲۲ مارچ ۱۹۳۵ء)

علامہ جمال الدین افغانی کا
ایک خطبہ

میں نہایت خوش ہوں کہ اس موقعہ پر اس قدر ہندی نژاد نوجوان جمع ہیں جو فضل و کمال سے آراستہ اور تحصیل علم کے لئے کوشاں ہیں۔ مجھے اس امر پر بھی خوش ہونا چاہیئے کہ یہ نونہال اس ہندوستان کے فرزند ہیں جو مہد انسانیت اور گہوارہ آدمیت ہے۔ یہ وہی ہندوستان ہے جہاں سے انسانیت نکل کر سارے عالم میں منتشر ہوئی!

یہ نوجوان اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں جہاں پہلی مرتبہ دائرہ معدل النہار معین ہوا۔ اور پہلی مرتبہ معدل النہار سے منطق البروج بنایا گیا۔ یہ دو دائرے اس وقت تک نہیں بن سکتے۔ جب تک کہ ہندسہ میں کمال نہ ہو، پس ظاہر ہوا کہ علم حساب اور ہندسہ ہندیوں کی ایجاد ہے۔ یہ نوجوان اس سرزمین کی اولاد ہیں جس نے تمام عالم کو قوانین اور ادب کا سبق پڑھایا۔ اگر کوئی شخص غور سے رومن کوڈ (قوانین ملت روما)، کا مطالعہ کرے جو تمام فرنگی قوانین کا سرچشمہ

ہے تو اسے صاف معلوم ہوگا کہ وہ چاروں وید شاستروں سے ماخوذ ہیں۔ ادب و شعر میں یونانی ہندیوں کے خوشہ چیں ہیں۔ چنانچہ فیثا غورث جس نے یونان میں علوم و معارف کی نشر و اشاعت کی اہل ہند کا ادنیٰ شاگرد تھا۔ یہ خاک ہند وہی خاک ہے۔ یہ ہوا وہی ہوا ہے۔ اور یہ نوجوان اسی خاک آب اور ہوا کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے میں نہایت خوش ہوں کہ یہ لوگ خواب دراز کے بعد چونکے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنی میراث پر قبضہ کرلیں۔ اور اپنے لگائے ہوئے درخت کے میوؤں سے پھر اپنا دامن بھرلیں۔

اب میں چاہتا ہوں کہ علم و تعلیم کے متعلق کچھ عرض کروں لیکن مشکل یہ ہے کہ علم کی کوئی حد معین نہیں ہے۔ علم و حکمت کا سمندر بے پایاں ہے۔ اور ہمارے افکار متناہی ہیں۔ لہذا غیر ممکن ہے کہ ایک متناہی شے، غیر متناہی کا احاطہ کرے۔ دوسرے یہ کہ علم کے بیان میں ہزاروں فصحاء بلغاء اور حکماء اپنی فصاحت، بلاغت اور حکمت کے جوہر دکھا چکے ہیں۔ پھر مجھ ایسے تہی مایہ کے لئے اس موضوع پر لب کشائی کرنا دشوار ہے۔ باوجود اس کے طبیعت قبول نہیں کرتی کہ اس کی فضیلت کو بیان نہ کروں۔ اگر کوئی غور کرے تو معلوم ہوجائیگا کہ دنیا کا بادشاہ علم ہے۔ بغیر علم کے نہ بادشاہی پہلے تھی نہ اب ہے اور نہ آیندہ رہے گی۔ کلدانی فاتح خصوصاً [illegible] جس کا حدود تاتار سے ہند تک پھریرا اڑتا تھا۔ وہ کلدانی فاتح نہ تھا۔ بلکہ دانش و علم

تھے۔ وہ مصری جنھوں نے اپنے ملک کو وسعت دی۔ ان ہی میں سے ایک بادشاہ راسیلس ثانی مسوپوٹومیا (بین النہرین) تک پہونچ گیا۔ اور دوسری روائت کے بموجب ہندوستان تک اپنا جھنڈا اڑادیا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ مصری نہ تھے۔ بلکہ علم تھا۔ فنیقی باشندے جنھوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیوں سے جزائر برطانیہ بلاد ہسپانیہ اور یونان کو اپنے مستعمرات میں داخل کرلیا۔ حقیقتاً وہ فنیقی نہ تھے بلکہ علم تھا۔ جس نے اپنے یدِ قدرت کو اس قدر قوت بخش دی تھی، سکندر یونان سے ہندوستان نہیں آیا اور نہ اس نے ہندوستان پر غلبہ پایا۔ بلکہ وہ علم تھا۔ جس نے یونان سے آکر ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ یہ فرنگی جنھوں نے اس زمانے میں چاروں طرف دست درازی شروع کردی ہے۔ انگریز جو افغانستان تک پہونچے ہوئے ہیں۔ فرنگ (فرانس) ٹیونس پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے ہیں، یہ تطاول، یہ دست درازی اور ملک گیری، نہ انگریز کر رہے ہیں نہ فرانسیسی۔ بلکہ ہر طرف علم و شوکت کی عظمت ظاہر ہے۔ اور جہل ہے کہ علم کے سامنے اظہار عجز اور اعترافِ عبودیت کرتے ہوئے سرنگوں خاک ذلت پر پڑا ہوا ہے۔ پس بادشاہی خانۂ علم سے کبھی باہر نہیں گئی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ بادشاہ ہمیشہ اپنا پایۂ تخت بدلتا رہتا ہے۔ کبھی یہ مشرق سے مغرب گیا۔ کبھی مغرب سے مشرق آیا۔ اگر اس سے گذر کر ہم دنیا کے غنا و ثروت پر نظر کریں تو معلوم ہوگا

کہ غنا و ثروت۔ تجارت۔ صناعت و زراعت کے نتائج ہیں۔ اور زراعت، علم فلاحت و نباتات و ہندسے کے بغیر ناممکن ہے۔ صناعت کیمسٹری۔ اور فزکس، جرِ اثقال۔ ہندسہ و حساب کے بغیر کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اور تجارت کا سارا دارو مدار صناعت و زراعت پر ہے پس معلوم ہوا کہ تمام ثروت و غنا علم کا نتیجہ ہے۔ اور علم کے سوا کوئی غنا نہیں۔ بالجملہ تمام عالمِ انسانی عالمِ صنائی ہے۔ یعنی دنیا دنیائے علم ہے۔ اگر عالمِ انسانی سے علم نکال لیا جائے تو کوئی انسان باقی نہیں رہے گا۔ علم انسان کو ہزار اور دس ہزار انسانوں کی قوت بخشتا ہے۔ جتنا زیادہ علم ہو گا۔ اتنا ہی زیادہ انسان اپنے آپ کو فائدہ پہونچا سکتا ہے اسی طرح حکومتوں کو اپنی رعایا سے بقدر علم نفع پہنچ سکتا ہے۔

ہر حکومت کا فرض ہے کہ اپنے نفع کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے علم و معارف کی تاسیس و نشر کی کوشش کرے۔ فرض کرو کہ کسی شخص کا باغیچہ ہو، تو وہ ازروئے قانونِ فلاحت زمین کو ٹھیک بنائے گا۔ درختوں اور نباتات کی اصلاح کی کوشش کرے گا۔ اسی طرح حکام کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنی منفعت کی خاطر علوم کو پھیلانے کی سعی کریں، جس طرح باغیچہ کا مالک اپنی ملک کی طرف توجہ نہیں کرے گا تو اس کی ذات کو نقصان پہونچے گا۔ اسی طرح اگر بادشاہ اپنی رعایا کی طرف سے غفلت برتے گا تو حکومت کو ضرور اس سے ضرر

پہونچے گا۔ جو بادشاہ جاہلوں پر حکومت کرتا ہے۔ اس بادشاہ سے کیا فائدہ؟ اور ایسی حکومت کا نام حکومت کس طرح رکھا جاسکتا ہے؟

تعلیم، تعلم اور مراتبِ علوم

جب شرفِ علم تھوڑا سا معلوم ہو چکا۔ تو اب میں چاہتا ہوں کہ تعلیم، تعلم اور مراتبِ علوم کے متعلق چند کلمات عرض کروں۔ یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہر علم کے لئے خاص موضوع ہے۔ اور اسی موضوع کے مطابق عوارض و لوازم کے سوا اس علم میں کسی غیر متعلقہ چیز سے بحث نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً علم فزیک عالم خارجی کے خواص اجسام سے بحث کرتا ہے۔ اور ان دوسرے امور سے جو عالم انسانی میں لازم ہیں معترض نہیں ہوتا۔ علم کیمیا یعنی کیمسٹری میں خواصِ اجسام کی تحلیل و ترکیب کی حیثیت و نوعیت پہ بحث ہوتی ہے۔ علم نباتات ”بوٹانی“ صرف نباتات کو اپنا موضوع بحث قرار دیتا ہے۔ بعینہ دوسرے تمام علوم کی یہی کیفیت ہے۔ ان علوم میں سے کوئی بھی اپنے موضوع سے خارج مباحث پر بحث نہیں کرتا۔ یہاں یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اگر علم کو ایک شخص تصور کرلیا جائے تو یہ جتنے علوم ہیں۔ سب اس کے اعضا قرار پائے، اور جس طرح یہ ممکن نہیں کہ ایک عضو جسم کی دوسرے اعضاء سے الگ ہو کر اپنا وجود قائم رکھ سکتا ہے۔ بعینہٖ

تمام علوم میں سے اگر کوئی علم بالکل الگ کر دیا جائے تو وہ باقی نہیں رہ سکتا۔ چونکہ ان میں سے ہر ایک حساب و ہندسہ کی طرح ایک دوسرے سے مربوط ہے۔ اس لئے ایک علم بغیر دوسرے علوم کے استمداد کے نہیں سمجھا جا سکتا ہے۔ پس ایک ایسا علم ہونا چاہئے۔ جسے تمام علوم کی روح کہا جا سکے، وہ علم جسے تمام علوم کی جان کہا جا سکتا ہے وہ فلسفہ یعنی حکمت ہے۔ کیونکہ اس کا موضوع عام ہے فلسفہ انسانی لوازم سے انسان کو خبردار کرتا اور دوسرے علوم کی حاجتوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر کسی قوم میں فلسفہ نہ ہو اور اس قوم کا ہر فرد ان تمام علوم سے آگاہ ہو جن کے موضوع خاص ہوں، تو یہ ممکن نہیں کہ صرف ایک صدی ہی تک ان میں وہ علوم باقی رہ جائیں۔ اور ناممکن ہے کہ وہ امت روحِ فلسفہ کے بغیر ان علوم سے نتائج نکال سکے۔ حکومت عثمانی اور خدیو مصر کی حکومت نے ساٹھ برس سے علوم جدیدہ کے لئے مدارس کھول رکھے ہیں۔ لیکن ابھی تک انہیں ان علوم سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان مدارس میں فلسفہ نہیں ہوتا ہے۔ دوسرے علوم جو اعضاء کی مانند ہیں۔ بغیر روحِ فلسفہ کے وہ کسی قسم کا پھل دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ اگر ان مدارس میں فلسفہ بھی ہوتا۔ تو اس ساٹھ برس کے طویل زمانہ میں یہ لوگ بلاد فرنگ سے مستغنی ہو جاتے او علم سے اپنے ممالک میں اصلاح کی کوشش کرتے ہر سال اپنی اولاد

کو ممالکِ فرنگ میں بھیجنے کی حاجت نہ رہتی۔ اور اپنے مدرسوں کے لیئے فرنگی استادوں کی ضرورت نہ پڑتی۔ میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ اگر ایک امت میں روحِ فلسفہ موجود ہے اور ان میں علوم جن کا موضوع خاص ہے موجود نہیں ہیں تو اس کے باوجود صرف یہی روحِ فلسفی ان تمام علوم کو حاصل کرنے کے لئے آمادہ کرگی۔

صَدرِ اولیٰ کے مسلمان

صدرِ اولےٰ کے مسلمانوں میں کوئی علم نہ تھا۔ لیکن ذہانتِ اسلامی کی وجہ سے ان میں ایک روحِ فلسفہ پیدا ہو گئی تھی۔ صرف اس روحِ فلسفہ کے واسطے سے انھوں نے تمام امورِ عالم اور لوازمِ انسانی سے بحث کرنی شروع کر دی۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے منصور (عباسی خلیفہ) کے زمانے میں ایسے تمام علوم کو جن کا موضوع بحث خاص تھا، سریانی، یونانی اور پارسی سے عربی ترجمہ کر کے تھوڑے دنوں میں سیکھ لیا۔ فلسفہ ہی وہ علم ہے جو بتلاتا ہے کہ انسان کو انسان سے کیا سلوک کرنا چاہیئے؟ شرفِ انسانیت کیا ہے؟ طریق ہائے لائقہ کون کون سے ہیں؟ ہر قدامت جو قعرِ پستی میں گر پڑی، اس کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ سب سے پہلے ان کی روحِ فلسفی میں نقص پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہی نقص ان کی تمام معاشرت اور ادب و علوم میں سرایت کر گیا۔

جب مراتبِ علوم اور شرفِ فلسفہ اس قدر معلوم ہو چکا تو اب میں یہ چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی تعلیم و تعلم کے بارے میں کچھ عرض

کریں۔ اس عہد میں مسلمانوں کو تعلیم سے کوئی فائدہ حاصل نہیں
ہوتا۔ مثلاً علم نحو کا مقصد یہ ہے کہ کوئی شخص لغتِ عربی پر حاوی ہو
جائے۔ اور اس سے اسے لکھنا۔ پڑھنا اور بولنا آجائے۔ لیکن اس
زمانے میں مسلمانوں کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سالہا سال اسی مقصد پر
بے فائدہ صرف کر دیتے ہیں، اور اتنی مدت ضائع کرنے کے بعد بھی
وہ عربی لکھنے پڑھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوتے۔ علم معانی و بیان جس کو
ادبیات کہتے ہیں۔ وہ علم ہے کہ اس سے انسان، منشی، خطیب اور
شاعر بنتا ہے۔ لیکن اس عہد میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کے حاصل کرنے
کے بعد لوگ معمولی صحیح گفتگو کرنے کے بھی لائق نہیں ہوتے، علمِ منطق
وہ علم ہے جسے ہر شخص کو حاصل کرنا چاہئے۔ اس سے حق و باطل میں
تمیز اور کھوٹے کھرے کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں
کے منطقیوں کے دماغ خرافات و واہیات خیالات کا گنجینہ بنے ہوئے
ہیں۔ ان کے خیالات اور بازاریوں کے افکار میں کوئی فرق نہیں ہوتا
علمِ حکمت وہ علم ہے۔ جو موجوداتِ خارجیہ کے احوال سے بحث کرتا اور
ان کے عِلل و اسباب۔ لوازم و ملزومات سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر مزہ
یہ ہے کہ ہمارے علماء شمس البازغہ سے اس علم کی ابتدائی باتیں پڑھ کر
اپنے آپ کو حکیم سمجھ لیتے ہیں، اور باوجود حکیم ہونے کے خود اپنی شناخت
بھی نہیں کر سکتے۔ اس پر کبھی غور نہیں کرتے کہ ہم کون ہیں۔ کیا ہیں؟
ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمارا کیا فرض ہے؟ عجیب مزہ یہ ہے کہ اپنے آگے

لیمپ رکھ کر رات بھر شمس البازغہ پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن اس نکتہ پر غور نہیں کرتے کہ اگر لیمپ کے شیشے کو نکال لیں تو اس سے دھواں کیوں نکلنے لگتا ہے اور اگر پھر لگا دیں تو دھواں کیوں نہیں نکلتا ؟ ایسے حکیم پر تین حرف اور ایسی حکمت پر لعنت!

حکیم وہ ہے کہ تمام حوادث و اجزائے عالم اس کے ذہن کو حرکت دیں۔ نہ کہ وہ جو اندھوں کی طرح ایک ڈگر پکڑ لیتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہے اور منزلِ مقصود کدھر ہے۔ مسلمانوں کا علم فقہ، تمام حقوق منزلیہ بدلیہ اور دولیہ پر حاوی ہے۔ پس ایسا شخص جو اس علم کا عالم ہو اس لائق ہے کہ ملک کا صدر اعظم یا حکومت کا سفیر ہو۔ مگر جب مسلمانوں کے فقہا پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر کے انتظام سے بھی عاری ہیں۔ مگر اپنی بے وقوفی کو سرمایۂ افتخار جانتے ہیں۔ علم اصول کے معنی فلسفہ شریعت ہیں جو شخص اس علم پر قادر ہو اسے واضع قوانین اور مدنیت کا علمبردار ہونا چاہئے۔ مگر مسلمانوں میں اس علم کے جو پڑھنے والے ہیں۔ وہ فوائد قوانین، قواعد مدنیت اور اصلاحِ عالم سے بے خبر ہیں۔ اس زمانے میں ہمارے علماء کی یہ کیفیت ہے، گویا وہ ایک بہت باریک فتیلہ ہیں کہ سر پر شعلہ تو ہے لیکن وہ اس قدر چھوٹا ہے کہ نہ اپنے ارد گرد روشنی پہونچا سکتا ہے، اور نہ دوسرے اس سے اُجالا پا سکتے ہیں۔

عالم، اگر حقیقی عالم ہے تو وہ ایک نور ہے، اگر عالمِ.. صحیح

معنوں میں عالم ہے تو اُسے چاہیے کہ ایک عالم پہ روشنی ڈالے اگر اتنا نہ ہو سکے تو کم ازکم اپنے شہر، گاؤں یا کچھ نہیں تو اپنے گھر ہی کو اِس روشنی سے منور کر دے۔ مگر اس شخص پہ عالم کا کیسے اطلاق ہو سکتا ہے۔ جو اپنے گھر تک کو علم کی روشنی سے منور نہیں کر سکتا؟ اس پر طرہ یہ کہ ہمارے علماء نے اِس زمانے میں علم کو دو اقسام پہ منقسم کر دیا ہے۔ ایک کو مسلمانوں کا علم کہتے ہیں۔ اور دوسرے کو علمِ فرنگ کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ بعض نہایت کار آمد اور مفید علوم کی تحصیل سے منع کرتے ہیں۔ اور یہ نہیں سمجھتے کہ علم کو کسی خاص طائفہ سے نسبت نہیں ہو سکتی۔ جو چیز پہچانی جاتی ہے وہ علم ہی کے صدقے سے پہچانی جاتی ہے۔ جو طائفہ ترقی کرتا ہے وہ علم ہی کی بدولت ترقی کرتا ہے علم سے انسانوں کو نسبت ہونی چاہیئے۔ نہ یہ کہ علم کو انسان سے نسبت دی جائے۔

کتنے تعجب کی بات ہے کہ وہ علوم جو ارسطو سے منسوب ہیں انھیں تو مسلمان نہایت رغبت سے پڑھتے ہیں۔ گویا ارسطو بھی کوئی مسلمان تھا۔ لیکن اگر گلیلیو، نیوٹن اور کیپلر سے نسبت دی جائے تو کفر کے فتوے لگنے لگیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس جگہ براہین اور دلائل موجود ہوں وہیں حق بھی موجود رہتا ہے۔ وہ لوگ جو ان علوم و معارف سے منع کرتے ہیں بزعم خویش یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مذہب اسلام کی بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ حالانکہ

علوم و معارف اور مذہب اسلام کی بنیادوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ حجۃ الاسلام امام غزالی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ,, منقذ من الضلال ،، میں کہتے ہیں کہ وہ شخص جو یہ کہتا ہے کہ ادلۂ ہندسیہ، براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ اسلام کے خلاف ہیں۔ وہ شخص اسلام کا جاہل دوست ہے اور ایسے دوست سے زندیق اور دشمنان اسلام اچھے ہیں۔ چونکہ ادلہ ہندسیہ، براہین فلسفیہ اور قواعد طبیعیہ بدیہیات میں سے ہیں چنانچہ اگر کوئی انسان یہ کہدے کہ دین منافی بدیہیات ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ خود اپنے دین کا ابطال کر رہا ہے۔ انسان کی پہلی تربیت دینی تربیت ہوتی ہے۔ لہذا اس وقت تک مسلمانوں کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہمارے مذہبی پیشوا خود آپ اپنی اصلاح نہ کرلیں۔ حقیقت پر جب نظر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہم میں جو تباہی پیدا ہوئی ہے۔ پہلے یہ تباہی ہمارے علماء و رؤسار دین میں پیدا ہوئی۔ اور اس کے بعد تمام امت میں سرایت کر گئی ×

(رسالہ نگار لکھنؤ دسمبر ۱۹۲۸ء)

,, تحریک اتحادِ اسلامی کے داعیِ اعظم حضرت علامہ جمال الدین افغانی مرحوم نے اپنے کلکتے کے دورانِ قیام میں یہ خطبہ نوجوانوں کو مخاطب کر کے البرٹ ہال میں ارشاد فرمایا تھا۔ اسے فارسی سے ترجمہ کیا گیا تھا۔

ہماری بعض معاشرتی خرابیاں

مسلمانوں میں جب کسی شخص کو قومی کام کرنے کا شوق ہوتا ہے تو وہ فوراً سیاسی کاموں میں پڑ جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سیاست بہت اہم چیز ہے۔ جب کسی قوم کے ہاتھ میں سیاسی اقتدار کی باگ ڈور آجاتی ہے تو وہ اِس طاقت کے ذریعہ قومی زندگی کے دوسرے شعبوں پر اثر ڈال سکتی ہے لیکن فقط سیاسی لکیر کا فقیر بن کر زندگی کے دوسرے شعبوں سے آنکھ بند کرلینے کو دانشمندی نہیں کہا جا سکتا، سیاست کی طرح معاشرت بھی ہماری زندگی کا بہت اہم پہلو ہے، ہندوؤں میں معاشرتی اصلاح کی خاطر ہندوستان کے طول وعرض میں بہت سی ایسی انجمنیں اور ادارے قائم ہیں، جنہوں نے اپنی قوم کی معاشرتی ترقی کے لئے بڑا قابل قدر کام کیا ہے۔ جب کبھی میں ان کے کام کے دوررس نتائج پر غور کرتا ہوں تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہندو جیسی قدامت پسند قوم میں جو معاشرتی نقطۂ نظر سے شاید دنیا کی سب سے زیادہ پس ماندہ قوم ہے گذشتہ نصف صدی کی مدت میں ہندو سوشیل کارکنوں کو اتنی کامیابی کیسے نصیب ہوئی اور جب اس کے خلاف مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالتا ہوں تو افسوس

ہوتا ہے کہ ہندوستان بھر میں مسلمانوں کا کوئی ایسا منظم ادارہ موجود نہیں جو کسی بڑے پیمانے پہ معاشرتی اصلاح کا کام کر رہا ہو۔ اگر کوئی ایسا ادارہ بھولے بھٹکے کہیں نظر آ بھی جائے تو اس قسم کی ہندو انجمنوں کے مقابلے میں اس کی حیثیت بچوں کے کھیل سے زیادہ نہیں ہے۔ ہندو فلسفے اور اسلامی فلسفے میں وہی فرق پایا جاتا ہے، جو سکون اور حرکت میں ہے، ہندو فلسفے کی مثال ایک پہاڑ کی ہے، اور اسلامی فلسفے کی مثال ایک سمندر کی سی ہے۔ پہاڑ کو پگھلا کر سمندر بنانا بہت مشکل ہے۔ مگر سمندر پہلے ہی سے پگھلا ہوا ہے، اس کو پگھلانے کی ضرورت نہیں۔ البتہ سمندر میں ایک سکون آگیا ہے۔ اب اس کو صرف طوفان آشنا کرنے کی ضرورت ہے۔ میں آج کی صحبت میں مسلمانوں کی بعض نہایت واضح اور کھلی ہوئی معاشرتی خرابیوں کی طرف اس امید پر اشارہ کروں گا کہ ہماری قوم کے وہ افراد جن کا دماغ کچھ سوچتا ہے۔ ان امور پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔

جہیز

پوری ہندو سوسائٹی اور خاص طور پر بنگال کے ہندو گھرانوں میں کسی لڑکی کا پیدا ہو جانا ایک مصیبت سے کم نہیں سمجھا جاتا، اس کے پیدا ہوتے ہی ماں باپ کے لئے یہ فکر اجیرن ہو جاتی ہے کہ جب یہ لڑکی شادی کے لائق ہو جائے گی، تو اس کے لئے جہیز کہاں سے آئے گا۔ ستم یہ ہے کہ یہ سب کچھ ایسی تعلیم یافتہ لڑکیوں کے لئے سمجھا جاتا ہے، جن کا وجود ہر قوم کے

لیے باعث فخر ہو سکتا ہے۔ ہندوؤں کے اس معاشرتی نقص کا مسلمانوں پر بڑا گہرا اثر پڑا ہے۔ چنانچہ بہت سے مسلمان لڑکے اور ان کے والدین شادی سے پیشتر یہ فرض کر لیتے ہیں کہ لڑکی ساتھ میں اتنا جہیز لے کر آئے گی کہ سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ گویا شادی لڑکی سے نہیں جہیز سے کی جاتی ہے۔

بہت سے خاندانوں کی لڑکیوں کی شادی محض اس وجہ سے نہیں ہوتی اور ان کی عمر کنوارپنے میں گزر جاتی ہے کہ ان کے والدین جہیز دینے کا مقدور نہیں رکھتے۔ یا اتنا جہیز نہیں دے سکتے جو لڑکے والوں کی توقع کے مطابق ہو۔ میں حیدرآباد کے چند ایسے خاندانوں سے واقف ہوں جہاں کی بعض بہت اچھی لڑکیوں کی شادی محض اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ ان لڑکیوں کے والدین اپنے ہونے والے دامادوں کو جہیز میں چاندی کے پلنگ، زمرد کی چوڑیاں، پکھراج کے جھومر، اور سچے موتیوں کے سمرن دینے سے قاصر تھے۔ مجھے ایک ایسا واقعہ بھی یاد ہے کہ میرے ایک دوست کی بہن کی شادی ایک جگہ صرف اس سبب سے ہوتے ہوتے رہ گئی کہ لڑکے والوں کے مطالبہ کے مطابق لڑکی والے جہیز کے علاوہ ساچق، مہندی، گانے، بجانے اور دعوت پر پچاس ہزار روپیہ خرچ کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ میری رائے میں لڑکے والوں کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اصل میں شادی لڑکی سے کی جاتی ہے جہیز سے

نہیں۔ جہیز کے مسئلے کو بالکل لڑکی والوں پر چھوڑ دینا چاہیئے، اگر لڑکی کے والدین کوئی جہیز دیتے ہیں تو دیں، اور نہ دیتے ہوں تو نہ دیں، اس پر اصرار کرنا ہرگز دانشمندی نہیں سمجھا جا سکتا۔

روپیہ کی عینک

دوسری خرابی یہ ہے کہ انسانی سماج کی دولت کے نقطۂ نظر سے امیر، متوسط اور غریب طبقوں پر جو تقسیم ہوئی ہے اس کا شادی کے معاملے میں ہندوستانی مسلمانوں پر جو اثر پڑا ہے، اس کی مثال دنیا بھر میں کہیں نہیں ملتی۔ امیر خاندانوں کی کئی لڑکیاں صرف اس سبب سے بغیر شادی بوڑھی ہو کر ملک عدم پہونچ جاتی ہیں کہ ان کے والدین اپنی آنکھوں پر روپیے کی عینک لگا کر داماد کی تلاش میں نکلتے ہیں جب انہیں اپنے جیسا کوئی دولت مند لڑکا نہیں ملتا تو وہ اپنی بیٹیوں کے کنوارپنے میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جانے کو پسند کر لیتے ہیں، مگر اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ اوسط درجے یا غریب طبقے کے کسی اچھے لڑکے کو کھوج کر اس سے اپنی لڑکی کی شادی کر دیں! حالانکہ ایسے لوگ اگر ذرا سی عقلمندی سے کام لیں اور اپنی آنکھوں سے روپیے کی عینک اتار کر اپنی لڑکیوں کی زندگی پر غور کریں تو یہ اصحاب اپنے دامادوں کو کچھ روپیے دے کر بہت آسانی سے کسی اچھے کام پر لگا سکتے ہیں، اس سے کئی دولت مند لڑکیوں کی زندگیاں سدھر سکتی ہیں اور وہ مختلف دماغی امراض میں مبتلا ہو کر پاگل ہو جانے یا کلب گھروں

اور ہوٹلوں کی زینت بننے سے بچ سکتی ہیں۔ اور اس طریقے سے قوم کے کئی غریب لڑکوں کی زندگیاں بھی سدھر سکتی ہیں۔

ایجاب و قبول

تیسری خرابی یہ ہے کہ اگرچہ شادی میں لڑکے اور لڑکی کی حقیقی مرضی معلوم کر لینا خالص اسلامی حکم ہے۔ مگر ہندوستانی مسلمانوں میں عموماً ایجاب و قبول صرف نکاح کے وقت رسماً ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس سے پہلے عموماً لڑکی یا لڑکے کی مرضی معلوم کرنا بالکل غیر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ گویا ہمارے یہاں شادی کی حیثیت ایک طرح سے جوے کی سی ہوتی ہے۔ جیسے جواری کو پانسہ پھینکتے ہوئے معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی جیت ہوگی یا ہار، اسی طرح ہمارے یہاں کی بہت سی شادیوں کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ شادیاں آئندہ چل کر کامیاب ہوں گی یا ناکام، البتہ کہیں کہیں لڑکوں کی اصلی مرضی معلوم کر لی جاتی ہے مگر لڑکی سے کچھ پوچھنا اب بھی ایک طرح سے گناہ سمجھا جاتا ہے۔ والدین جس طرح چاہتے ہیں اپنی طبیعت کے مطابق جس سے جی چاہتا ہے لڑکی کی شادی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ عقل۔ مذہب فطرت اور حکومت، چاروں کے قانون سے یہ طریقہ غلط ہے شادی کا فلسفہ صرف اتنا ہے کہ نسل انسانی برقرار رہے اور ایک مرد کو عورت اور عورت کو ایک مرد ہاتھ آ جائے جو زندگی کے سفر میں یا حقیقی معنوں میں دکھ سکھ کا ساتھی بن سکے۔ جب کسی تعلیم یافتہ لڑکی

کی کسی جاہل دولت مند سے شادی کردی جائے گی تو لازماً دونوں میں نباہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زندگی کے مسائل پر غور کرنے کے معاملہ میں دونوں کا نقطۂ نظر قطعاً جداگانہ ہے۔ ایک کے نزدیک دولت بجائے خود زندگی کی آخری منزل ہے، اور دوسرے کے نزدیک دولت زندگی کے مقاصد کو پورا کرنے کا آلہ ہے، شادی کرنے سے پہلے اس بات کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے کہ دونوں کی طبیعت ایک دوسرے سے میل کھاتی بھی ہے یا نہیں۔

اسلامی فرقوں میں باہمی شادی کی ضرورت

چوتھی خرابی یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان پلیٹ فارم اور اخباروں میں رات دن یہ اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ساری دنیا کے مسلمان بھائی بھائی ہیں، لیکن عمل میں ان کا یہ حال ہے کہ تمام مسلمان مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ کوئی سُنی ہے اور کوئی شیعہ۔ کوئی کچھ ہے اور کوئی کچھ،

لیکن بقول اقبال مرحوم سچے مسلمان بہت کم ہیں۔ ؎

دم بھر میں بنا دی مسجد تو ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس مذہبی تقسیم کے علاوہ نسلی تقسیم کا بھی دور دورہ

ہے مثلاً راجپوت نسل کے مسلمان جب شادی کرینگے تو اپنی ہی نسل میں اگر کوئی شخص ذرا جراءتِ رندانہ سے کام لے کر کسی دوسری نسل میں شادی کرے تو ساری برادری پنجے جھاڑ کر اسکے پیچھے پڑ جائے گی۔ خوجوں۔ بوہروں اور دوسرے فرقوں میں بھی یہ خرابی عام ہے۔ ایسی شادیوں کی مثالیں کم ملتی ہیں کہ ایک بوہرے لڑکے نے کسی دوسرے فرقہ کی لڑکی سے شادی کی ہو۔ یا کسی خوجہ لڑکی نے کسی دوسرے فرقہ کے مسلمان لڑکے سے شادی کی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کی اور جماعتوں سے کٹ کر علیحدہ رہنے کی پالیسی سے ان فرقوں کو ہر نقطۂ نظر سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور اگر جلد ان لوگوں نے اپنی اس پالیسی کو خیرباد نہیں کہا تو وہ دن دور نہیں کہ انکی اجتماعی زندگی بہت جلد ختم ہو جائے گی اور یہ لوگ ایک ایسی اقلیت بنکر رہ جائینگے جسکی مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں کوئی آواز نہ ہوگی۔ جب سارے مسلمان اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ ان کا خدا ایک رسول ایک اور قرآن ایک ہے اور دوسرے تمام جھگڑے فروعی ہیں تو پھر باہمی شادیاں کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ اگر ایسی شادیاں عام ہو جائیں تو مسلمانوں کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے قریب آجائیں گے۔ اور سیاسی لیڈر مسلمانوں کے اندر جس اتحاد کے متوقع ہیں اسکے حاصل ہونے میں بہت آسانی پیدا ہو جائیگی اب تمام مسلمانوں کو زمانے کی رفتار کو سمجھنا چاہئے اور ایسی تمام معاشرتی برائیوں کو فی الفور چھوڑ دینا چاہئے جو محسوس یا غیر محسوس طور پر دوسری قوموں سے مسلمانوں میں آگئی ہیں اور جو ہمارے قومی جسم کو گھن کی طرح کھاتی چلی جارہی ہیں۔

عندلیب بمبئی ۱۳؍ اگست
۱۹۴۱ء

مطبوعہ سلطانی فائن آرٹ اینڈ لیتھو پرنٹنگ پریس بھنڈی بازار بمبئی نمبر ۳

اردو ادیبوں کیلئے ایک لمحۂ فکریہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک ادیب جو کچھ محسوس کر کے لکھتا ہے وہ ادب ہے۔ لیکن ادیب سماج کا۔ ایک زندہ اور متحرک فرد بھی ہے۔ چونکہ ادیب کے پاس اپنے معاشرے کو آگے بڑھانے کے لئے، قلم کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں اس لئے اسے بھی عالم انسانی کی، سیاسی، معاشی و معاشرتی، ترقی کے لئے اپنے قلم سے حصۂ رسدی پیش کرنا چاہئے۔

چنانچہ وقت آگیا ہے کہ اُردو کے ادیب ہندوستانی سوسائٹی کی موجودہ بنیادی تبدیلیوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور اس امر پر غور کریں کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ اور کس کے لئے لکھ رہے ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو ہندوستان کو ابد الاباد تک غلام رکھنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دوسری طرف ہندوستانی عوام ہیں جو غلامی کی چکّی میں گیہوں کی طرح پستے چلے جا رہے ہیں۔ ایک طرف

موٹے تازے مہاجن ہیں جو سود در سود کی لعنت کے ذریعے جمہور کا خون چوس کر روز بروز جونک کی طرح موٹے ہوتے چلے جا رہے ہیں دوسری طرف بیچارہ بے زبان قرض دار ہے۔ جو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے قرض لینے پر مجبور ہے۔ ایک جانب جاگیردار اور زمیندار ہیں جو بیکس اور بے بس زمین جوتنے والے کی گاڑھی کمائی کو لگان اور نذرانوں کی شکل میں وصول کر کے رقص و سرود کی محفلوں میں داد عیش دینے کے عادی بن چکے ہیں۔ دوسری طرف بھولا بھالا کسان ہے۔ جو صبح سے شام تک ہل چلانے کے سوا دنیا و مافیہا سے بے خبر ہے۔ ایک طرف موٹر نشین کارخانہ دار ہے جو اپنی دولت کے نشہ میں فرعون و نمرود کی جانشینی کا دعویدار ہے دوسری طرف وہ غریب مزدور ہے جو صبح سے شام تک مسلسل محنت کرنے کے باوجود، اپنا اور اپنے بچوں کا نہ پیٹ بھر سکتا ہے، اور نہ تن ڈھانک سکتا ہے۔ ایک طرف رنجگر کا وہ ذہین و طباع بیٹا ہے جسے اگر زیادہ تعلیم حاصل کرنیکا موقع ملتا تو اپنے وقت کا نیوٹن، اور آئن اسٹین بنجاتا۔ دوسری طرف نواب صاحب کا وہ غبی اور کودن، مگر ریشم کی طرح نازک و نرم لڑکا ہے جو زبردستی کالج میں ٹھونس دیا گیا ہے۔ ایک طرف وہ جگمگاتی ہوئی رانیاں اور بیگمات ہیں، جو راجاؤں اور نوابوں کے تاریک شبستانوں میں بجلی کے قمقموں کی طرح چمکتی رہتی ہیں۔ دوسری طرف وہ مفلس و نادار خواتین

ہیں جو دن بھر مزدوری کرتی ہیں، یا وہ مظلوم عورتیں ہیں جنہیں سوسائٹی نے روٹی کمانے کے لئے بیسوا بننے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک جانب مذہب کے مہا پنڈت اور امام ہیں جن کے ہاتھوں میں بیکنٹھ اور جنّت کی کنجیاں ہیں۔ اور دوسری جانب وہ بے خبر دیہاتی ہے جسے شب و روز محنت کرنے پر بھی پیٹ بھر کر روٹی میسر نہیں آتی۔ ایک طرف سرکاری مشنری کے پرزے پیدا کرنے والی یونیورسٹی کا وہ جاہل پروفیسر ہے جس کا صحیح مقام کسی میوزیم کا ممی سیکشن ہے اور دوسری طرف وہ تازہ دم اور جواں ہمت طالب علم ہے جس کا ہاتھ ہمیشہ سوسائٹی کی دکھتی ہوئی رگ پر رہتا ہے۔ ایک طرف وہ وکیل ہے جو قانون کی طلسم ہوشربا کا حافظ ہے۔ اور دوسری طرف وہ انجان موکل ہے۔ جو مدتوں سے آئین کی بھول بھلیاں میں بھٹک رہا ہے۔ ایک طرف سنگدل ڈاکٹر ہے جو رحم و کرم کے جذبات سے قطعاً معرا ہے، دوسری طرف آسمان کے شامیانے کے نیچے فٹ پاتھ پر پڑا ہوا بیروزگار بیمار ہے جو بہت جلد موت کے منہ میں جانے والا ہے۔ ایک طرف وہ ریسرچ اسکالر ہے جس کی تحقیقات کا دائرہ، اُن تیسرے درجے کے شاعروں کی تاریخ پیدائش و موت تک محدود ہے۔ جنہیں ان کے شعروں کے ساتھ زمانہ ہمیشہ کے لئے ماضی کے قبرستان میں دفن کر چکا ہے، دوسری طرف وہ بلند فکر نوجوان ہے جو انسانیت کی خدمت کرنے والے گمنام سپاہیوں کے ان شاندار کار

کارناموں کی تحقیق میں مصروف ہے۔ جو اقوام و ملل کی زندگی کو نئی شاہ راہیں دکھاتے ہیں۔

ایک طرف ظالموں کے قہقہے اور قلقل مینا کی صدائیں ہیں دوسری طرف سماج کی مشین کے نیچے دبے ہوئے مظلوموں کی چیخیں اور فریادیں ہیں، اب یہ ہمارے ادیبوں کا کام ہے کہ وہ ان دونوں جماعتوں میں سے کسی ایک کے لئے لکھنا پسند کر لیں۔

یا عقل کی روباہی یا عشق ید اللّٰہی
یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ

(مصور۔ بمبئی ۵۔ مارچ ۱۹۳۹ء)

دلہن کا انتخاب

بھوتوش کالج میں انگریزی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ مگر اسے انگریزی تمدن و تہذیب سے دلی نفرت تھی۔ وہ مجبوراً کالج میں پڑھتا تھا۔ ورنہ اسکی یہ خواہش تھی کہ کسی سنسکرت ودیالہ میں جاکر تعلیم حاصل کرے۔ وہ قدیم ہندو تہذیب و تمدن کا شیدا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت رنج ہوتا تھا کہ ہندو قوم اپنی قدیمی روایات کو فراموش کرتی جاتی ہے والدین کے مجبور کرنے پر وہ بادل ناخواستہ انگریزی پڑھ رہا تھا۔

درگا پوجا کی چھٹی کا زمانہ آگیا۔ اور دوسرے طلباء کی طرح بھوتوش بھی خوش خوش اپنے گاؤں روانہ ہو گیا۔ یہاں اسے اپنی والدہ سے ملکر سچی مسرت حاصل ہوئی۔

پوجا کے ختم ہونیکا زمانہ قریب آپہونچا۔ بھوتوش کی ماں گنگا اشنان کرنے گئی۔ وہاں اسکی ملاقات بچپن کی ایک سہیلی سے ہو گئی۔

یہ اپندرا بابو کی بیوی تھی۔ دونوں کو اس اتفاقیہ ملاقات سے بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد اوپیندرا بابو کی بیوی نے پوچھا "کیا بھوتوش بھی آیا ہے؟"

"وہ آیا اور رخصت ختم ہو جانے کے باعث واپس چلا بھی جائیگا۔"

اور اپیندرا بابو کی دختر اپنی خوبصورتی اور نیک سیرتی کے لئے مشہور تھی، ابھی اسکی شادی نہ ہوئی تھی،

اوپیندرا بابو کی بیوی نے پوچھا "اگر میری پلینا اور بھوتوش میں شادی ہو جائے تو کوئی ہرج ہے؟"

بھوتوش کی ماں نے خوش ہو کر جواب دیا "میری تو مدتوں سے یہی خواہش ہے، لیکن میرا بیٹا شادی کو گناہ سمجھتا ہے، میرا کیا بس چلتا ہے میں نے تو بارہا کوشش کی مگر ہمیشہ ناکام رہی"

"اچھا ایک بار اور کوشش کرو۔ اگر بھوتوش کی دلہن گھر میں آجائے تو تمہاری دلبستگی کا سامان بھی ہو جائیگا"

بھوتوش کی ماں نے کہا "اگر وہ راضی ہو جائے تو آئندہ فروری میں شادی ہو جائیگی"

یہ کہہ کر وہ مکان پر واپس آئی۔ بھوتوش اخبار پڑھ رہا تھا اس نے کہا "بھوتوش ذرا دیر کے لئے اندر کے کمرے میں آؤ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں"

بھوتوش آہستہ آہستہ اندر پہنچا۔

بوڑھی ماں نے امید و بیم کی حالت میں کہا:-

"بیٹا میں نے ایک جگہ تمہاری شادی کا بندوبست کیا ہے تم میرے نور نظر ہو۔ میری آرزو ہے کہ اپنی آنکھوں کے سامنے تمہاری شادی رچاؤں، بھگوان کے لئے تم میری مرادوں پر پانی نہ پھیرو"

بھوتوش اُن اسباب کی بنا پر شادی کا مخالف نہ تھا۔ جن کی آڑ لیکر انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان شادی کرنا پسند نہیں کرتے ہیں وہ شادی کو ناپسند نہ کرتا تھا۔ مگر اس معاملہ میں اسکے خیالات عجیب غریب تھے وہ جانتا تھا کہ اس زمانے کی ہندو عورتیں، قدیم ہند کی خواتین کے نقش قدم پر چلنا پسند نہیں کرتیں۔ راجپوت دیویوں اور اس عہد کی لڑکیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آجکل کی لڑکیوں کا وقت اپنے آپ کو سنوارنے اور حسن کو اُبھارنے میں صرف ہوتا ہے۔ وہ اپنے شوہر سے برابری کا دعویٰ کرتی ہیں۔ اور اسکی فرماں برداری کرنا اپنی توہین سمجھتی ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود اپنی بوڑھی ماں کا دل کیسے توڑ سکتا تھا۔ وہ اپنے دامن پر نافرمانی کا داغ نہ لگنے دینا چاہتا تھا لہٰذا اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اصرار کرنے پر شادی کے لئے رضامند ہو جائیگا۔

بھوتوش کے احباب شادی کے مسئلے پر اسکے عجیب و غریب نظریہ سے واقف تھے۔ ہوسٹل (دارالاقامہ) میں اکثر اس مسئلہ پر دلچسپ بحث چھڑ جاتی تھی۔ بھوتوش اکثر اس طرح اپنے خیالات کا

اظہار کیا کرتا تھا۔

میں کسی بدصورت سیاہ فام لڑکی ہی سے بیاہ کروں گا۔ کسی حسین دوشیزہ سے شادی کرنا گناہ سمجھتا ہوں۔ وہ اپنے شوہر یا ساس کا حکم ماننے کو اپنے لئے کسر شان سمجھتی ہے اور سرتا پا مغربیت میں رنگی ہوئی ہوتی ہے۔ اسکے سینٹ۔ اور نفیس ساڑھیوں کا بل ادا کرتے کرتے غریب شوہر دیوالیہ ہو جاتا ہے۔ اسکے علاوہ میں کسی تعلیم یافتہ لڑکی سے بھی شادی کرنا پسند نہیں کرتا۔ اسکا وقت ناول پڑھنے اور موسیقی کی مشق کرنے میں بسر ہوتا ہے۔ وہ بچوں کی تعلیم وتربیت کا خیال نہیں کرتی۔ کیونکہ شوہر کو خط لکھنے ہی سے اسکو فرصت نہیں ملتی

اس فلسفیانہ تقریر کے ختم ہوتے ہی ساری محفل قہقہوں سے گونج اُٹھتی تھی۔ کبھی کبھی ان میں سے کوئی کہہ اُٹھتا " بھوتوش بابو تقریر کرنا اور اس تقریر پر عمل کرنے میں بہت فرق ہے "

اس پر بھوتوش بگڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ اور نہایت سنجیدگی سے کہتا تھا " حضرات وقت آنے پر ثابت ہو جائیگا کہ میرے قول و فعل میں کوئی فرق نہیں ہے "

ان باتوں کا خیال کرتے ہوئے بھوتوش نے اپنی ماں سے کہا:۔

" ماں! میں شادی تو کر لوں گا مگر اپنی دلہن کا خود انتخاب کرونگا "

ماں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، " اچھا تم شادی سے پہلے اپنی دلہن کو دیکھنا چاہتے ہو۔ میں ایک حسین لڑکی کو جانتی ہوں جو ابھی عہد شباب

کی اولین منزل میں ہے،،

،، پریشان ہو کر بھوتوش نے پوچھا ،، کیا وہ حسین ہے ،،۔

ماں نے مسکراتے ہوئے کہا وہ چاند کی طرح خوبصورت ہے اسکا رنگ گلاب جیسا ہے ،،

بھوتوش نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا ،، ماں میں کسی حسین لڑکی سے شادی نہ کروں گا ،،

ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا ،، اسمیں کیا ہرج ہے ؟ ،،

،، میں کسی خوبصورت عورت کو شریک زندگی بنا کر اپنی زندگی تباہ نہیں کرنا چاہتا ،،

،، اچھا تو تم کس طرح کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو ،،

،، ایک بدصورت لڑکی سے ،،

،، ماں کو سخت تعجب ہوا ،

،، بیوقوف لڑکے سب حسین لڑکیوں کی جستجو میں رہا کرتے ہیں بہت تلاش کے بعد بھی انہیں مقصد میں کامیابی نہیں ہوتی ،،

بھوتوش نے متانت سے جواب دیا ،، اُن سے مجھے کیا تعلق ۔ اس قسم کی میں شادی ہرگز نہ کروں گا ،، اب اسکا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا ۔ اپنی والدہ کو افسردہ خاطر دیکھ کر اس نے سمجھایا کہ ایک خوبرو لڑکی کے لئے اپنے فرائض کی انجام دہی اور قدیم ہندو دیویوں کے نقشِ قدم پر چلنا کس قدر دشوار ہے ،،

ماں نے اس مسئلہ پر اس سے اور زیادہ گفتگو نہ کی ، اور وہ کلکتہ

چلا گیا

ایک دن اوپیندرا بابو کی بیوی پالکی میں بیٹھ کر بھوتوش کی ماں سے ملنے آئی۔

"کیوں بہن بھوتوش راضی ہو گیا؟"

"وہ شادی کرنے پر راضی تو ہے۔ مگر اس مسئلہ پر اسکے خیالات بڑے مضحک اور احمقانہ ہیں"

"وہ کیا؟"

"سب سے پہلے اس نے دلہن کو دیکھنے کی منشا ظاہر کی، میں نے بھی اس خیال کی تائید کی۔ مگر بعد میں وہ کہنے لگا کہ کسی سیاہ فام اور بدصورت عورت سے شادی کروں گا"

" اوپیندرا بابو کی عورت کو یہ سنکر بڑی حیرت ہوئی۔ میں نے آجتک اس قسم کی بات کبھی نہیں سنی۔ آخر یہ خیال اسکے دماغ میں کہاں سے آیا"

اب مایوس اور غم زدہ ماں نے اس عجیب قسم کے خیال کے اسباب اسے سنائے، یہ سنکر تھوڑی دیر تک اوپیندرا بابو کی بیوی کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ یکایک کسی خیال نے اسکے چہرہ پر مسرت کی لہر دوڑا دی۔ اس نے سر اٹھا کر کہا بہن تم ایک کام کرو، بھوتوش کو دو ایک روز کے لئے یہاں آنے کو لکھو۔ یہ بھی لکھدو کہ اسکے خیال کے مطابق ایک لڑکی مل گئی ہے۔ جب وہ آجائے تو اتوار کی صبح اسے ہمارے گھر بھیجدینا باقی سب انتظام میں کر لوں گی"

بھوتوش کی ماں نے منظور کر لیا۔ اور سمجھی کہ شاید پلینا پر نظر پڑتے ہی بھوتوش اسکے دلم گیسو کا اسیر ہو جائے۔ دوسرے روز بھوتوش آ گیا۔ اتوار کے روز وہ اوپیندرا بابو کے گھر پہنچا۔

اسکے دل کی عجیب کیفیت تھی، ایک نوکر اسے اندر لے گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن یہ ایک ایسا عقدۂ لاینحل تھا کہ جسے بھوتوش نہ حل کر سکا۔ ایک آراستہ کمرے میں وہ داخل ہوا اور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ خاموشی سے تمام معاملات پر غور کرنے لگا۔ ایک لمحہ کے بعد کسی مستِ خرام کی پازیب کی جھنکار سے وہ چونک پڑا۔ ایک نوجوان لڑکی اسکے سامنے آ بیٹھی اور ترچھی نگاہوں سے اُسے گھورنے لگی۔ گلابی رنگ کی ایک ساڑھی پہنے ہوئے تھی سر کھلا ہوا تھا رنگ توے کی طرح سیاہ تھا آنکھیں اندر کی طرف دھنسی ہوئی تھیں ایسی بدصورت عورت بھوتوش کی نظروں سے کم گزری ہو گی وہ بالکل چڑیل معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر بھوتوش کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس سے بہتر دلہن ملنا تقریباً ناممکن ہے

"تمہارا نام ؟"

"جگدمبا"

اس زمانہ میں اس قسم کے ناموں کا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن قدیم ہندو اسے بہت پسند کرتے تھے۔ لڑکی کے منہ سے یہ عجیب نام نکلتے ہی میزبان اور خادم دونوں نے دانت پیسکر غصہ سے دیکھا۔ لڑکی نے کہا "میرا نام پلینا ہے"

بھوتوش نے حیرت سے کہا "پہلے یہ جگہ مبا تھی اب پلینا بنگئی"

"تم تعلیم یافتہ ہو؟"

"نہیں، مجھے کتابوں سے دلی نفرت ہے"

اس جواب سے میزبان نے پھر اسے چشم عتاب سے دیکھا۔ مگر وہ دزدیدہ نگاہوں سے بھوتوش کو گھورتی رہی۔ بھوتوش بہت خوش ہوا۔ اور دل میں کہنے لگا کہ شادی کے بعد اسے ہندو عورتوں کے سامنے پیش کروں گا۔ اور دوستوں کے سامنے بھی غرور سے سر اُٹھا سکوں گا۔ اب اس نے اس لڑکی کو جانے کی اجازت دی۔ خادم اسے باہر لے گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ رخصت ہونے ہی کو تھا کہ ایک شکیل نازنین پان لیکر کمرے میں داخل ہوئی۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ اِس حسینہ کے لبوں پر بجلی کی طرح دوڑ گئی اس کی دلکش ادا سے بھوتوش بابو کا دل تڑپ گیا۔ اور کف افسوس ملتے ہوئے وہ بولے اگر اپنی بات کا پاس نہ ہوتا تو میں اس سندری ہی سے بیاہ رچاتا۔

لیکن بھوتوش کو اپنی مستقل مزاجی پر روحانی خوشی ہو رہی تھی خادمہ آکر اس حسینہ کو باہر لے گئی۔ اس نے ہلتے ہوئے پوچھا۔

"کیا دلہن کو آپ پسند کرتے ہیں؟"

اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "بیشک"

مکان واپس جاتے ہوئے بھوتوش نے اُداسی کی ایک جھلک

سی پائی۔ دریا سے گنگا جل لیے لڑکیاں آ رہی تھیں، مگر ان میں کوئی بھی بدصورتی میں جگدمبا کی حریف نہ ٹھہر سکتی تھی، وہ کہنے لگا "کاش میری دلہن اتنی بد صورت نہ ہوتی مگر اب تو وہ قول ہار چکا تھا، اور اسکے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اپنی بات پر قایم رہے،

ماں نے پوچھا "کیوں بیٹا دلہن دل کے مطابق تھی؟"

"ہاں ماں"

"تو پھر شادی کا انتظام کروں؟"

"بھوتوش خاموشی سے سر ہلا کر چلا گیا۔

بوڑھی ماں کو ایسا معلوم ہوا کہ گویا بھوتوش رنج والم میں ڈوبا ہوا ہے اس نے تاڑ لیا کہ وہ اپنی بیہودہ ہٹ پر اب دل ہی دل میں پشیمان ہو رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ بھوتوش ابھی تک اپنے قول پر قایم تھا۔ اور بڑے صبر و شکر سے اپنی قسمت کا تماشہ دیکھنے کو تیار تھا۔

بھوک نہ ہونیکا بہانہ کر کے اس نے شب کو کچھ نہ کھایا۔ اس کے دل میں مختلف خیالات کے درمیان کشاکش جاری تھی۔ جگدمبا کی تصویر سامنے آتے ہی اسکے دل کا دیا بجھ جاتا تھا۔ اگر وہ کچھ پڑھی لکھی ہی ہوتی تو بھوتوش کے دل کو ٹھنڈک پہنچتی۔

پیر کی صبح وہ کلکتے روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے ماں نے بتایا کہ شادی میں صرف دس دن باقی ہیں اور اسے شادی سے دو دن پہلے آ جانا چاہیے،

ہوسٹل میں دوستوں سے یہ بات بھلا کہاں چھپی رہ سکتی تھی، انہوں نے

یکے بعد دیگرے آکر سوالات کی بوچھاڑ کر دی،

"کیوں بھائی ہمارے لئے کیا خبر لائے ہو؟"

اس نے ہنستا ہوا چہرہ بنا کر جواب دیا "اچھی خبر ہے"

اب دلہن کی صورت، سیرت، رنگ روپ، ڈیل ڈول، غرض کہ مختلف قسم کے سوالات ہونے لگے۔ یکایک ایک لڑکا پوچھ بیٹھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"جگد مبا"

حیرت سے سب نے اسکی طرف دیکھا، اور ایک فرمائشی قہقہہ لگایا،

"جگد مبا! واہ وا، کیا اچھا نام ہے، ایک نے سوال کیا۔ اس بیوقوفی کی ہنسی سے کیا حاصل؟"

"ہا! ہا! میں ہنس تو نہیں رہا ہوں۔ نام کا مذاق اڑانا تو بالکل فضول ہے، اگلے زمانے میں ایسے نام پسند کئے جاتے تھے"

بھوتوش متین اور سنجیدہ لڑکا تھا اور اب پہلے کا جوش و خروش بھی باقی نہ تھا اسلئے وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

شادی کو اب صرف نو دن باقی تھے۔ جگد مبا کا خیال آتے ہی وہ لرزہ بر اندام ہو جاتا۔ اور مستقبل کے خوفناک تصور سے اسکا دل کانپنے لگتا۔ وہ کالج میں جاتا مگر اسکا دل لکچر میں نہ لگتا۔ اب وہ ہر وقت غمگین اور اداس رہنے لگا۔

بھلا کالج کے لڑکے، اس موقع پر چٹکیاں لینے سے کیسے چوکتے؟ وہ کہا کرتے تھے کہ بھوتوش کو عشق کا زخم بہت کاری لگا ہے، رات کو

ے پریشانی اور ہجوم افکار سے بالکل نیند نہ آتی تھی، ایک رات مشکلوں سے ذرا لھ جھپکی تو ایسے خوفناک خواب آنے لگے کہ وہ بار بار چونک کر اُٹھ بیٹھتا تھا شب اسے بڑا ڈراؤنا خواب دکھائی دیا۔

اس نے دیکھا کہ جگدمبا کھڑی ہے۔ اسکی صورت کالی ماتا سے بہت مشابہت رکھتی ہے۔ اسکے ایک ہاتھ میں برہنہ شمشیر ہے اور دوسرے میں کسی بدنصیب کا سر ہے۔ بھونوش کو دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ وہ سر خود اسی کا تھا

ایک دوسرے خواب میں اس نے اپنے آپکو صحرانوردی کرتے ہوئے پایا یکایک ایک شیرنی نے اس پر حملہ کیا۔ یہ شیرنی ایک سیاہ ساڑھی پہنے ہوئے ھی۔ اور اسکی صورت جگدمبا سے ملتی جلتی تھی۔

جب شادی میں تین دن باقی رہے تو بھونوش نے ماں کو خط لکھ کر شادی رکوا دینی چاہی، اس دن وہ کالج بھی نہ گیا۔ اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھتا رہا۔ پریشانی اسقدر بڑھ گئی تھی کہ وہ پورا ایک خط بھی نہ ھ سکا۔ اس نے ارادہ کیا کہ کہیں دوسری جگہ چل کر تنہائی اور گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرے۔ مگر اسکے ضمیر نے اس بزدلانہ خیال پر عمل پیرا ہونیکی اجازت نہ دی۔ آخر اس نے سوچا کہ جو کچھ قسمت میں لکھا ہے وہ ہو کر رہیگا مجھے اپنا عہد پورا کرنا چاہئے۔ مردوں کا یہی شیوہ ہے۔

وقت مقررہ پر وہ مکان پر جا پہنچا۔ جہاں شادی کی دھوم دھام نے تھوڑی دیر کے لئے اسکی کھوئی ہوئی مسرت کو پھر واپس لا دیا۔ شادی رسم شروع ہوئی بھونوش اپنے آپ کو بھی فراموش کر چکا تھا۔

نہ وہ مسرور تھا نہ غمگین، نہ اداس تھا، نہ اسکا دل امیدوں سے بھرا ہوا تھا۔

آخر گھونگھٹ اُٹھانے کی رسم پورا کرنیکا وقت آ پہنچا۔ بھوتوش نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے گھونگھٹ اُٹھایا۔ لیکن یہ دیکھ کر اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ کریہہ منظر جگدمبا کے بدلے حسین بلینی دلہن ہے۔ بعد میں، اپنی حسین دلہن کی زبانی بھوتوش کو معلوم ہوا کہ اُسے اسکے عزمِ صمیم سے ہٹانے کے لئے یہ چال چلی گئی تھی۔ ورنہ جگدمبا تو گاؤں کے تیل بیچنے والے کی لڑکی ہے۔

آخر ایک دن ایسا آیا کہ حسین بیوی کے خط کے انتظار میں بھوتوش چشم براہ بنے سڑک پر ڈاکیے کا بےچینی سے انتظار کرتے ہوئے نظر آیا کرتا تھا۔

(ریاست دہلی)

(بابو پربھات کمار مکرجی کے ایک بنگالی افسانہ کا ترجمہ۔)

JAMMU & KASHMIR UNIVERSITY
LIBRARY
No 24894
Date 7-2-59
SRINAGAR

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN